TEXT CUT WITHIN THE BOOK ONLY

UNIVERSAL LIBRARY
OU_222245
UNIVERSAL LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵ ۴۳۳۲م Accession No. ۹۹۳۲

Author تاجور نجیب ت م

Title منتخب افسانے جلد اول

This book should be returned on or before the date last marked below.

تصانیف بلا استثنا بتذلل اور معذرانہ انداز کی ہوتی ہیں ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جہاں انگریزی لٹریچر کی فضیلت کے ثبوت میں ملٹن۔ شیکسپیئر۔ شیلے۔ ورڈسورتھ۔ جانسن۔ میکالے اور رانڈر ہیگرڈ وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ وہاں اُردو ادبیات کی محفل بھی میر و غالب۔ انیس اور دبیر۔ حسن اور نسیم۔ داغ اور حالی۔ آزاد اور نذیر احمد۔ سرشار اور شرر۔ سرسید اور شبلی۔ اکبر اور اقبال جیسی بلند پایہ شخصیتوں سے خالی نہیں ؛

اس میں شک نہیں کہ اُردو حکمران قوم کی زبان نہ ہونے کے باعث اس قدردانی سے محروم ہے جو ہندوستان کے بیس کروڑ باشندوں میں تبادلۂ خیالات کے آسان ترین وسیلہ کی حیثیت سے اُس کا جائز حق ہونا چاہئے مگر اُس کی بے بضاعتی کا رونا اس کی اور اُس کے اہل قلم کی ناقدری سے زیادہ ان مفروضہ اثرات پر مبنی ہے۔ جو کسی چیز کی ناقدری اور کس مپرسی کے قدرتی عواقب سمجھے جاتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ اس کا محرک یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر اُردو کو بے مایہ اور تہی دامن نہ کہا جائیگا۔ تو کہنے والے کی ہمہ دانی۔ وسعت مطالعہ بلکہ خوش مذاقی پر بھی حرف آئیگا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اُردو نے اس کس مپرسی کی حالت میں بھی جملہ مراحل ارتقا کو حیرت آفرین سرعت سے طے کیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ خداداد اہلیت اپنے اظہار کے اسباب خود مہیا کر لیتی ہے یہ ناقابل انکار صداقت ہمیشہ کے

لئے مستور نہیں رہ سکتی کہ رطب و یابس کے اِس انبار اور خس و خاشاک کے اس ذخیرہ میں جو آجکل اصطلاح عامہ میں اُردو لٹریچر کا دوسرا نام ہے۔ اس قدر مسالہ موجود ہے کہ اگر اس کی طباعت کا انتظام مناسب اہتمام کے ساتھ کیا جائے تو ممتاز سے ممتاز لائبریریوں کی زینت میں گرانبہا اضافہ ہو سکتا ہے۔

اُردو مرکز کے سلسلے میں ہمیں اُردو لٹریچر کے وسیع مطالعہ سے جو تجربہ ہُوا اُس کی بنا پر علیٰ رؤس الاشہاد ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُردو لٹریچر کے منتخبات سے یونیورسٹی کے تمام اعلیٰ مدارج کے لئے کورس تیار ہو سکتے ہیں۔

"خدمت زبان" اور "خدمت ادب" کی جو صدا تمام طول و عرض ہند میں گونجی ہوئی ہے اور ملک کے بہتر سے بہتر دل و دماغ اِس کے لئے جس طرح وقف کار و جد و جہد ہیں اس میں شک نہیں کہ وہ بہت اُمید افزا ہے مگر اُسی کے ساتھ ہم اِس اظہار خیال سے بھی باز نہیں رہ سکتے کہ تعلیم و تربیت کے ابتدائی منازل سے لیکر اعلیٰ سے اعلیٰ طبقات علمی کے لئے جب تک اُردو ادب کے ایسے منتخب نمونے (جو ہمارے پست دور زندگی کے زہر آگین عناصر سے بالکلیہ پاک ہوں) کی ترویج و اشاعت کا انتظام نہ کیا جائیگا اور اِس طرح ملک میں جب تک ایک اعلیٰ اور صالح ذہنیت و صلاحیت نہ پیدا کیجائیگی اُسوقت تک "خدمتِ اُردو" کے سلسلے میں ہماری بڑی سے

بڑی سعی بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ بار آور نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ہم کامل یقین و وثوق کیساتھ یہ خیال رکھتے ہیں کہ اُردو اور اس کی ادبی خدمات کے ضمن میں سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ ایک ایسا سلسلہ مجلدات تیار کیا جائے جسے حقیقی معنوں میں اپنا لٹریچر کہتے ہوئے ہم کوئی ندامت نہ محسوس کر سکیں۔ اس قسم کے منتخب لٹریچر کی اشاعت سے نہ صرف یہ کہ اُردو میں ایک مخصوص تابناک دورِ حیات کا آغاز ہوگا بلکہ اس سے ہماری آیندہ نسلیں ادبی گمراہیوں سے محفوظ رہ کر ایک اعلیٰ ذہنیت اور معقول صلاحیت علمی کی بھی حامل ہو سکیں گی +

"ایک اچھی لائبریری ایک ارزاں یونیورسٹی ہے"

یہ کسی یورپین مصنف کا قول ہے جس کی بلیغ معنویت اپنے اجمال و ابہام میں بھی کسی مزید تفصیل و توضیح کی محتاج نہیں۔ اُردو مرکز کے ان مقاصد عالیہ میں جو اُردو مخزن العلوم کی تدوین اور اردو زبان کے دارالافتا کی تنظیم پر مشتمل ہیں اردو ادب کے نادر و کارآمد حصے کا تحفظ بھی داخل ہے چنانچہ مذکورہ خیالات کی بنا پر اُس نے اپنے لائحہ عمل کی اوّلین دفعہ یہی رکھی ہے کہ اُردو زبان نے اپنی موجودہ مدتِ حیات میں جو صالح اور جاندار ذخیرۂ ادب تیار کیا ہے اُسے مسلسل مجلدات میں ترتیب دے اور اس طرح اس یوروپین مصنف کے مذکورۂ بالا قول میں خفیف سی ترمیم کر کے

"ایک اچھی یونیورسٹی ایک ارزاں لائبریری کی شکل میں"

ملک کے سامنے پیش کر دے +

تجاویز اور "اسکیم بازی" خوش فکر دماغوں کا ایک عمل تعیش ہے
اصل سوال "ہو تو کیونکر ہو" کا ہے۔ اسلئے ہم نے سب سے پہلے ملک کے
بعض مشاہیر سے اس باب میں استمزاج کیا۔ اُردو مرکز کے نمایندگان خصوصی
نے زحمت سفر برداشت کر کے بعض بزرگوں سے بالمشافہ گفتگو کی اور
طریق انتخاب طریق کار کے متعلق اُن سے نہایت مفید مشورے بھی حاصل
کئے۔ اُن بزرگوں میں سے مندرجہ ذیل اصحاب کے اسمائے گرامی خصوصیت
کے ساتھ قابل ذکر ہیں :-

علامہ عبد الحلیم شرر مرحوم - علامہ عمادی - مولینا عبد الماجد بی-اے
مصنف فلسفہ جذبات و فلسفہ اجتماع - مرزا اعجاز حسین دہلوی بی-اے
ایل-ایل-بی وکیل - مولینا سید غلام بھیک نیرنگ بی-اے وکیل
پروفیسر رشید احمد صدیقی ایم-اے لکچرار مسلم یونیورسٹی و مدیر سہیل علیگڈھ
پروفیسر کشوری موہن مترا ایم-اے-ایم-آر-اے-ایس (لنڈن)
مولینا سید جالب دہلوی ایڈیٹر "ہمدم" لکھنؤ - ڈاکٹر شانتی سروپ
ایم-ایس-سی-ڈی-ایس-سی یونیورسٹی پروفیسر - میاں بشیر احمد بی-اے
آکسن بیرسٹر ایٹ لا ایڈیٹر ہمایون - خان بہادر ڈاکٹر سر میاں محمد شفیع
بیرسٹر ایٹ لا کے-سی-ایس-آئی-سی-آئی-ای-ایل-ایل-ڈی :-
مولینا سید راشد الخیری دہلوی ایڈیٹر رسالہ عصمت دہلی - چودھری فتح دین
ایم-اے ڈویزنل انسپکٹر آف سکولز ملتان ڈویژن - مولینا سید ناصر نذیر
فراق دہلوی - چودھری محمد حسین صاحب بی-اے-پی-آئی-ایس

ڈی۔آئی منٹگمری۔ شیخ ظہور الدین صاحب بی۔اے۔پی۔آئی۔ایس
ڈی۔آئی۔لائل پور۔ خان بہادر مولوی خورشید احمد صاحب بی۔اے
ریٹائرڈ ڈویژنل انسپکٹر راولپنڈی۔ راجہ فاضل محمد خان صاحب بی۔اے
پی۔ای۔ایس ڈپٹی انسپکٹر راولپنڈی ڈویژن۔ چودھری غلام رسول
صاحب شوق ایم۔اے۔پی۔ای۔ایس۔ڈی۔آئی ڈیرہ غازیخان
خواجہ دل محمد صاحب ایم۔اے۔ایم۔آر۔اے۔ایس (لنڈن) پروفیسر
اسلامیہ کالج لاہور۔ مولینا وحید الدین سلیم پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی
ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی
مولنا سالک ایڈیٹر انقلاب۔ مولینا حافظ احمد علی خان صاحب
منصرم کتب خانہ ریاست رام پور۔ مولینا خلیقی دہلوی۔
حضرت ہوش بلگرامی ایڈیٹر ذخیرہ ؁

اس کے علاوہ اور اکثر خوش مذاق حضرات سے جو اردو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں تبادلہ خیالات کا موقع آتا رہا مگر مذکورہ اصحاب میں سے خصوصیت کے ساتھ جس نے اُردو مرکز کے کاموں سے دلچسپی کا اظہار فرمایا وہ علامہ شرر مرحوم کی ذات تھی۔ موصوف نے نہ یہ کہ طریق کار کے متعلق مشورے عنایت فرمائے بلکہ بعض صحبتوں میں اپنا گراں بہا وقت فراہمی مواد اور مشکلات انتخاب کے حل کرنے میں بھی صرف فرمایا موصوف کا یہ وعدہ بھی تھا کہ آخر جنوری تک لاہور تشریف لاکر اور کچھ دنوں قیام فرما کر اردو مرکز کے کاموں میں اعانت بھی فرمائینگے مگر افسوس مرحوم کی اچانک رحلت نے ان

تمام حوصلوں کو بار آور ہونے نہیں دیا۔

یہ صحیح ہے کہ ہمنے اخبارات و رسائل میں اپنی ان تجاویز و عزائم کا کوئی شور نہیں مچایا اسلئے کہ ؎

"عشق کاریست کہ بے آہ و فغان نیز کنند"

صرف مخصوص اربابِ قلم کی خدمت میں ایک ایک مطبوعہ تحریر بھیجکر اُن سے میٹر (مواد) اور مفید مشوروں کی التجا کی تھی۔ اس تحریر کی نقل بجنسہٖ درج ذیل ہے :-

جناب محترم!

یہ امر جناب سے پوشیدہ نہیں کہ ملک کا بہی خواہ اور علم دوست طبقہ ایک مدت سے اُردو کو دُنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی سطح پر لانے کیلئے بیقرار ہے۔ اس حیثیت سے موقت الشیوع جرائد و رسائل اور ملک کی چھوٹی بڑی علمی جماعتیں اور انجمنیں جو کچھ کر رہی ہیں انکا کافی احترام رکھتے ہوئے ہمیں اس حقیقت کے اظہار بغیر چارہ کار نہیں کہ کام کی اہمیت اس تنگنائے فکر سے گذر کر مزید وسعتِ عمل کی محتاج ہے "اُردو مرکز" (ملک کی واحد اُردو اکاڈمی جو دُنیائے ادب کے مشاہیر اہلِ قلم کی گرانقدر مجلس کی نگرانی میں ایک بڑے سرمایہ سے قائم کی گئی ہے لئے اس امر کو ملحوظ رکھکر اپنے مجوزہ نظام عمل کے لئے حسب ذیل دفعات مقرر کئے ہیں :-

(۱) اُردو کے اُس حصہ ادب و شاعری کو (جو محفوظ رکھنے کے قابل

ہے اور جو دراصل اُسکی آیندہ ترقیات کا اصلی ہیولیٰ بھی ہے جلد سے جلد انتخاب کے بعد مستقل مجلّدات کی صورت میں ترتیب دینا +

(۲) اُردو میں ایک مخزن العلوم (انسائیکلوپیڈیا) تیار کرنا +

(۳) اردو زبان کے فتوحات ادبیہ کا ایک منتخب مجموعہ سال بسال مجلّدات کی شکل میں پیش کرتے رہنا +. (۴) گرانقدر نایاب مطبوعہ و غیر مطبوعہ اُردو کتابوں کی ترتیب و تہذیب اور حسب استطاعت ہر قسم کی علمی و ادبی اردو تصنیفات و تالیفات کی اشاعت +

(۵) اردو مرکز کی مجلس مشاورت (جو درحقیقت اُردو زبان کیلئے ایک ادبی دارالافتاء ہے) کے ذریعہ علمی ضروریات کے مناسب جدید الفاظ کی اختراع اور متنازعہ فیہ امور ادبیہ کے متعلق ناطق فیصلہ +

ان دفعات کی اوّلین قسط یہ ہے کہ نظم و نثر کے اس بہترین حصّہ کو جسے اُردو ادب اپنی موجودہ مدّتِ حیات میں فراہم کرسکا ہے ایک باقاعدہ و منتظم صورت میں ملک کے سامنے پیش کردے ۔ یہ مجموعہ جہاں ایک طرف اُردو ادب و شاعری کا حاصل و عطر ہوگا وہیں یہ امر بھی مدنظر ہے کہ حتی الامکان اس میں ایک حدّ خاص تک ترتیب تاریخی بھی ملحوظ ہے تاکہ ہر دَور کے خصوصیات اور ادبی دماغ کے ارتقائی مدارج کا بھی سرسری طور پر اندازہ ہوسکے ۔ اس التزام کے ساتھ ساتھ یہ اہتمام بھی پیش نظر ہے کہ شعراء او اُدباء کی تصاویر اور اُن کے حالات سے بھی (جس قدر دستیاب و میسر ہوسکیں) ان مجلّدات کی رونق و زینت میں اضافہ کیا جائے

ان بلند اور وسیع عزائم کی اہمیت اور ان کے مشکلات کا جناب
خود ہی اندازہ فرما سکتے ہیں۔ اُردو مرکز لاہور نے خدا کا نام لیکر
اس کام کو شروع کر دیا ہے جسے ارباب ذوق کی مشہور و قابل قدر جماعت
نہایت سرعت سے انجام دے رہی ہے بلکہ اس کام کا ایک بڑا
حصہ پریس میں بھی جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے مشہور فضلا و ادیب
بھی اپنے زرّیں مشوروں اور آعزازی خدمات سے اُردو مرکز کی اعانت
فرما کر خدمت زبان کا غیر فانی ثبوت دے رہے ہیں لیکن مشرقی اخلاق
و ذہنیت کی ناقابل تردید عظمت یہ ہے کہ یہاں کے کاموں کی
تمام مشکلات کو صرف سرمایہ و مالیات ہی کے زور پر حل
نہیں کیا جا سکتا اسلئے کہ ملک میں بحمد اللہ ایسے غیور و عالی حوصلہ
بزرگوں کی کمی نہیں جو ملک کے مفید کاموں کی اعانت و حوصلہ
افزائی کو مادّی "سود و زیان" سے آلودہ کرنا پسند نہیں کرتے
اور صرف بے غرضانہ اعانت کو اپنی خدمات کا حقیقی نعم البدل
تصوّر کرتے ہیں۔ نظر بران جناب سے بکمال ادب گذارش ہے کہ
اپنی نظم و نثر کا ایک منتخب اور خوشخط مجموعہ مع اپنے حالات
اور بلاک کے (اور اگر بلاک موجود نہ ہو تو تصویر) اردو مرکز
انارکلی لاہور کے نام ارسال فرمائیں اسی کیساتھ ہمارے کاموں کے
متعلق اگر کوئی مفید مشورہ بھی عنایت فرمائینگے تو اسے بھی نہایت شکریہ
کیساتھ قبول کیا جائیگا۔ اُردو نظم و نثر کی کوئی ایسی کارآمد تصنیف و

تالیف جو ابتک کنجِ گمنامی میں پڑی ہوئی ہو اسکے منتخب حصے معہ مصنف یا مؤلف کے حالات کے اگر دستیاب ہو سکیں تو وہ بھی براہِ عنایت ارسال کئے جائیں۔ اس قسم کی زرّیں امداد دینے والے حضرات کا اس تاریخی سلسلہ میں شکریہ کے ساتھ اعتراف کیا جائیگا۔ اسکے علاوہ کارکنانِ اُردو مرکز ایسے تمام حضرات سے جنہوں نے اُردو ادب و شاعری کی کوئی خدمت انجام دی ہو یہ اُمید کرتے ہیں کہ وہ خود بھی اس نادر موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینگے اسلئے کہ ان کے حالات اور گرانمایہ کارنامے اگر اُردو ادب شاعری کے اس مستقل اور مبسوط ریکارڈ اور مخزن میں نہ آئے تو یہ امر بڑی حد تک طرفین کیلئے قابل افسوس ہوگا ؎ **المُلتمس** مہتمم اردو مرکز۔ انارکلی لاہور

چنانچہ اس درخواست پر اطراف ملک سے ہماری جسقدر حوصلہ افزائی کی گئی وہ ہماری اُمیدوں سے کہیں زیادہ تھی۔ انتہا یہ کہ بعض کرمفرماؤں نے تو اپنے مستقل کارنامہ ہائے علمی ہمیں انتخاب و طباعت کیلئے مرحمت فرمادئے جن سے گو ہم بقدر ضرورت ہی متمتع ہو سکے تاہم اُنکی مخلصانہ اعانت کے تہ دل سے معرف و سپاس گذار ہیں ؎

اُردُو اَدَبْ اور اُس کا سَرمایۂ علمی

ابتدائی انتظامات مکمل ہو چکنے کے بعد ہم نے پانچ ہزار روپیہ کے صرف سے ایک لائبریری مرتب کی اسمیں ہمیں جو دقتیں پیش

آ ئیں وہ بہت صبر آزما تھیں۔ مروجہ کتب کا حاصل کر لینا تو چنداں دشوار نہ تھا کسی مطبع یا کتبخانہ کی فہرست اٹھائی اور اسمیں سے جو کتابیں مفید مطلب نظر آئیں۔ انکی قیمت منی آرڈر کے ذریعے ارسال کر دی۔ لیکن جو نادر الوجود اور عسیر الحصول نسخے ملک کے دور افتادہ گوشوں میں قدیم مگر گمنام گھرانوں اور غیر معروف لائبریریوں کے اندر لالۂ صحرا کی طرح اپنی جان نواز نکہت رائگان کر رہے ہیں ان کے مہیا کرنے میں صرف زر سے زیادہ تلاش و تحقیق کی ضرورت تھی بہر حال جہاں سے اور جس طرح جو کتابیں مل سکتی تھیں ہم نے اپنی لائبریری میں جمع کیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اردو ادب کی کل کائنات اتنی ہی نہیں اسکی گرانبہا متاع وہ علمی مضامین ہیں جو انتہائی تلاش و کاوش سے ملک کے سر آورد ارباب فکر کے قلم سے وقتاً فوقتاً نکلتے رہے ہیں اور جنکے حقیقی سرمایہ دار ہمارے ادبی رسائل ہیں جو ایک مدت سے غیر محسوس طور پر خدمت زبان کی انجام دہی میں مصروف ہیں ان رسائل میں مندرجۂ ذیل خصوصیت کیساتھ قابل ذکر ہیں:۔

مخزن۔ معارف علیگڈھ۔ معارف اعظم گڈھ۔ اردو (دکن) الناظر لکھنؤ زمانہ کانپور۔ اردوئے معلیٰ علی گڈھ۔ نگار بھوپال۔ علی گڈھ میگزین۔ ذخیرہ حیدر آباد۔ دکن ریویو۔ ہمایوں۔ بہارستان۔ نیرنگ خیال۔ ہزار داستان دلگداز۔ ادیب۔ الہلال۔ کہکشاں۔ العصر۔ نوید۔ نقاد۔ شمع آگرہ خطیب دہلی۔ تمدن دہلی۔ کوکب گونڈہ۔ عالمگیر لاہور۔ شباب اردو لاہور۔ نقیب بدایوں۔ دلکش مراد آباد۔ صوفی۔ المعلم (دکن)۔ پیمانہ۔ نورجہاں۔ عبرت۔ زبان قوس قزح۔ مرقع لکھنؤ۔ افادہ آگرہ۔ افادہ حیدر آباد۔ تحفہ حیدر آباد۔ صلائے عام دہلی

کمال دہلی۔ زبان اُردو لاہور۔ ادیب اُردو لکھنؤ۔ نظارہ میرٹھ نوبہار علیگڈھ وغیرہ +

مذکورہ رسائل کی ادبی خدمات کا اندازہ آپ اس سے کرسکتے ہیں کہ آج تقریباً ہر شعبۂ علم کے متعلق ہم ایک معتدبہ و معقول مواد فراہم کرچکے ہیں اُنہیں ہمیں ادبی مضامین بھی ملے جنہیں اس حد تک اجتہاد فکر و دقت نظر سے کام لیا گیا ہے کہ ہم انہیں اکتشافات و تحقیقات علمیہ کا درجہ دیسکتے ہیں اخبارات اور رسائل پر بیشتر سرسری نظریں پڑتی ہیں اور کسی اچھے سے اچھے مضمون کو بھی دیکھکر اردو ادب کی مجموعی حیثیت کا بالعموم اندازہ نہیں ہوتا لیکن ان تمام رسائل سے ہر موضوع اور ہر بحث کو اگر علیحدہ علیحدہ بالترتیب جمع کیا جائے تو معلوم ہو کہ اردو ادب کا آج کیا درجہ ہے اور وہ زبان جو محکومیت کے آغوش میں نشو و نما پارہی ہے آج کس حد تک آزاد ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش چلنے کیلئے بیقرار ہے +

چنانچہ کارکنان اُردو مرکز نے مستقل تالیفات و تصنیفات کے علاوہ مذکورہ رسائل کے گہرے مطالعہ و انتخاب کے بعد کئی لاکھ صفحات کا عطر کھینچ کر رکھدیا ہے اور آج ہم اس امر کے اعلان کی جسارت رکھتے ہیں کہ تقریباً تمام شعبہ جات علم و ادب کی ہمنے ڈیڑھ سو مجلدات تیار کرلئے ہیں اور جہانتک حالات مساعدت کرینگے ہم انشاءاللہ بہ اقساط انہیں برابر شایع کرتے رہینگے۔ ان مجلدات سے نہ صرف یہ کہ ملک میں ایک سنجیدہ و کارآمد لٹریچر کی اشاعت ہوگی بلکہ ایک ایسی مختصر سی لائبریری بھی بآسانی تیار ہوسکتی ہے جس سے عام اہلین و مصنفین بڑے بڑے دفاتر کی ورق گردانیوں سے بے نیاز ہوسکتے ہیں آیندہ جس کسی مصنف کو کسی اہم مضمون تصنیف و تالیف کی ضرورت ہوگی وہ اُس تصنیف یا تالیف کے متعلق اردو مرکز کے منتخبات میں ایک ہی جگہ ضروری مواد فراہم پاکر لائبریریوں میں

مہینوں کی تلاش و جستجو اور ضخیم کتابوں کی ورق گردانی کی زحمت سے بچ جائیگا ٭

انتخاب نظم و نثر کے متعلق ملک کے سربرآوردہ ارباب فکر کے قیمتی مشورے اور خوش مذاق کارکنوں کا طریق کار اگرچہ کام کی عمدگی کی کافی ضمانت ہے۔ تاہم شروع سے لیکر آخیر تک کمزور انسانوں ہی نے اسے انجام دیا ہے اس لئے اسے "خطا و نسیان" سے کسی طرح مبرّا نہیں کیا جاسکتا۔ ابتدائے کار سے لیکر اسوقت تک ہمنے ہر مشورے کا کافی احترام کیا ہے۔ اور چونکہ یہ کسی فرد واحد کا کام نہیں ہے اسلئے قدرتی طور سے بھی ضد و تعصب کی اسمیں گنجائش نہیں۔ چنانچہ ہم کامل فراخدلی کیساتھ یہ حوصلہ رکھتے ہیں کہ ان مجلّدات کی طباعت و اشاعت کے بعد بھی موافق و مخالف دوست و دشمن کی کسی صف سے جو معقول صدائی اصلاح اُٹھیگی اسکا کمال مسرت کیساتھ خیر مقدم کیا جائیگا اور دوسرے ایڈیشن میں شکریہ کیساتھ اس کی تصحیح و تلافی کردی جائیگی ٭

شعرا و مصنّفین کی تصاویر اور ان کے حالات کی فراہمی میں بھی حتی الوسع ہم نے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا مگر جو التزام و اہتمام ہمارے پیش نظر تھا وہ افسوس کہ خاطر خواہ انجام نہ پاسکا ٭

گذشتہ شعرا و مصنّفین میں سے بعضوں کے حالات اور اُن کی تصاویر اگر میسّر نہ آسکیں تو چندان عجب نہیں ستم ظریفی تو یہ ہے کہ عصر موجودہ کے بعض بزرگوں کو بھی اپنے حالات و تصاویر دینے

ہیں بخل و تامل ہوا۔ خدانخواستہ اسلیئے نہیں کہ نا محرم نگاہیں اُن پر پڑینگی بلکہ انکسار کی بے کیف فرسودگی اور "میں کس قابل ہوں" کی رسم کہن کا یہی تقاضا تھا۔ حالانکہ اس سے کہیں بہتر عذر "عذر تساہل" ہے جو شعار بے نیازی" کا بھی حامل ہے اور شایانِ ذہانت بھی تاہم اس باب میں ہماری کوششیں جس قدر بار آور ہوسکی ہیں وہ نذر ناظرین ہیں ؂

طباعت و اشاعت

اب ان مجلدات کی طباعت و اشاعت کا مسئلہ تھا جسمیں خوش آیند تصورات کے بجائے سرمایہ مالی کی ضرورت تھی اسکے لیئے ہم میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز لاہور کی فراخ حوصلگی کے رہین منت ہیں جنہوں نے ان مجلدات کی طباعت و اشاعت کی ذمہ داریاں لیکر اردو ادب کی ایک عظیم الشان خدمت کا تہیہ کیا ہے۔ ان مجلدات کی اشاعت پر اب تک اس فرم کا پچاس ہزار روپیہ صرف ہوچکا ہے اِس کے علاوہ ڈیڑھ سو مجلدات اور تیار ہیں جو وقتاً فوقتاً استعداد حالات کے مطابق شائع کیئے جائینگے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اور کس قدر روپیہ صرف کرنا پڑیگا۔ یو۔ پی میں منشی نولکشور آنجہانی کی وہ مساعی جمیلہ جو خدمت اردو کے متعلق ہیں اپنی آپ مثال ہیں۔ لیکن میسرز عطر چند کپور کی فرم کا یہ تہیہ بھی اپنے مقام پر جسقدر حوصلہ افزا و قابل ستائش ہے وہ بھی شاید اُردو کی تاریخ میں فقید المثیل ثابت ہو۔ انکا یہ کارنامہ یہ نہیں کہ

تجارتی کاروبار کے ضمن میں ایک عظیم الشان حوصلہ مندی ہے بلکہ وہ ایک اولوالعزمانہ ملکی خدمت ہے جسے دراصل جریدۂ علم و ادب پر شہرتِ دوام کی مہر بنکر ثبت ہونا چاہیئے +

اُردو مرکز کا اسٹاف

ہم نے ذوقِ جستجو کو رہبر بنا کر ملک کے ان منتخب اہلِ قلم و انشا پردازوں کی خدمات حاصل کی ہیں جن پر اُردو دنیا بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ اس گران قدر ادبی جماعت نے جس انہماک و شغف سے اُردو مرکز کے مفوضہ فرائض کو سرانجام دیا اُس کا اعتراف نہ کرنا حد درجہ کی ناانصافی ہوگی۔ درحقیقت اردو مرکز عبارت اسی جماعت سے ہے اخباری دنیا سے تعلق رکھنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو ان حضرات کی قدر و منزلت سے واقف نہ ہو۔ ان کے اسمائے گرامی اس امر کی کافی شہادت ہیں کہ اُردو مرکز ملک کے بہترین انشاپردازوں کی ایک قابلِ فخر جماعت ہے +

فہرست کارکنان اُردو مرکز

١۔ حضرت اصغر مصنف نشاط روح

٢۔ سید عابد علی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ سلیڈیٹر ہزار داستان

٣۔ شیخ محمد ضیاء الدین شمسی جرنلسٹ

۴ میاں تصدق حسین خالد ایم۔ اے۔
۵ مسٹر منوہر سہائے انور سہنسوانی جرنلسٹ۔
۶ پنڈت میلارام وفا ایڈیٹر سوراجیہ۔
۷ مولینا حامد علی خان صاحب بی۔ اے۔ (منیجر)
۸ حضرت فاخر ہریانوی۔ بی۔ اے۔
۹ شیر علی خان صاحب سرخوش مصنف تذکرہ اعجاز سخن۔
۱۰ شیخ عبداللطیف صاحب تپش بی۔ اے۔
۱۱ اصغر حسین خان صاحب نظیر لدھیانوی۔
۱۲ حضرت جگر مراد آبادی۔
۱۳ مولینا گویا جہان آبادی۔
۱۴ مولینا سیماب اکبر آبادی ایڈیٹر پیمانہ۔
۱۵ شیخ محمد ہادی حسین قریشی ایم۔ اے۔
۱۶ سردار اودے سنگھ شائق بی۔ اے ایل ایل بی۔
۱۷ مسٹر یوسف سلیم بی۔ اے۔

اُردو مرکز کی مجلس مشاورت

اردو مرکز کے کاموں میں مسلسل طور پر مشورہ کی زحمت جن حضرات نے فرمائی۔ ان کی التفات بے پایاں کا اعتراف بھی ہم صدق دل سے کرتے ہیں۔ یہ محترم حضرات صرف یہی نہیں کہ اپنا وقت عزیز پابندی کے ساتھ

اردو مرکز کے منتخبات پر ناقدانہ نظر ڈالنے پر صرف کرتے رہے۔ معیار انتخاب قائم کرنے میں اپنے زرّین مشوروں سے مسلسل طور پر ہماری امداد فرمائی۔ بلکہ اردو مرکز کے خلاف للّٰہی بغض رکھنے والی سازشی جماعت کے حملوں کے لیئے ان کی مقتدر شخصیتیں سدِّ سکندری ثابت ہوئیں۔

اراکین مجلس مشاورت

آنریبل خان بہادر سر شیخ عبد القادر بیرسٹرایٹ لا۔ ریوی نیو ممبر ایگزیکٹیو کونسل پنجاب

خان بہادر شیخ نور الٰہی صاحب ایم اے۔ آئی۔ ای۔ ایس۔ انسپکٹر آف ٹریننگ انسٹیٹیوٹس صوبہ پنجاب۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی (ادبی نقاد)

آخر میں ہم اس خدائے قادر و توانا کا شکر ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتے جس نے مہانخانۂ غیب سے ہمارے لئے یہ اسباب و وسائل فراہم کر دیئے۔ اور اپنے لطف و کرم سے ہمیں بُری بھلی خدمتِ زبان کی توفیق عطا فرمائی۔ لیکن اُسی کی عادتِ جاریہ یہ بھی ہے۔ کہ وہ ہر اعلیٰ و صالح تحریک کے لئے مخالفین و مزاحمین کی بھی ایک جماعت تیار کر دیتا ہے۔ ورنہ پھر نہ تو کسی پُر مغز و مخلصانہ خدمت کی قدر و قوت کا اندازہ ہو اور نہ اُسے پوری طرح پھیلنے اور کامیاب ہونے کا موقع مل سکے۔

ہندوستان میں جہاں تعمیر کے مقابلہ میں شوقِ تخریب اور بڑھانے کے عوض نیچے گھسیٹنے کا جذبہ نسبتہً زیادہ ہے۔ ہم اِس سعادت سے کیونکر محروم رہ سکتے تھے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ اردو مرکز اپنی ناچیز خدمات کا کوئی عملی ثبوت پبلک میں پیش کرے۔ بعض حلقوں میں اس کے متعلق پیشتر ہی سے چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ غالب نے کہا تھا ؎

ندانم تا چہ برق فتنہ خواہد ریخت بر ہوشم
تصوّر کردہ ام بگسستنِ بند نقابش را

یہاں بھی اردو مرکز اور اس کے کارناموں کا "گسستن نقاب" تو ایک طرف محض اُس کے تصوّر ہی سے ایک تلاطمِ اضطرار پیدا ہوگیا۔ اور گھبرا گھبرا کر ہمارے دوستوں کی نگاہیں اپنے اپنے ترکشوں پر پڑنے لگیں۔ چنانچہ اردو مرکز اور اُس کے اراکین کے متعلق پرائیویٹ صحبتوں کے علاوہ اخبارات و رسائل کے صفحات میں بھی مختلف رنگ اور مختلف عنوانوں سے تنقیص و تعریض کا شریفانہ عمل شروع ہوگیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہماری طرف سے "اشتراکِ عمل" کی دعوت عام تھی بایں ہمہ بعض حلقوں میں اگر ایسی بے چینیاں موجود ہوں۔ جن کی بنیاد میں ناگفتہ بہ جذبات کارفرما ہیں۔ تو شاید ہماری اور اُن کی متفقہ کوششیں بھی انہیں زائل نہیں کرسکتیں۔ بہرحال ہمیں اور ہمارے دوستوں کو اپنا اپنا کام کرتے رہنا چاہیئے۔ انجام کار کا فیصلہ اُسی خدا پر ہے۔ جس نے محمود کو حاسد پر۔ فراخ دلی کو تنگ نظری پر۔ تعمیر کو تخریب بجا پر ہمیشہ فتح

دی ہے۔ اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ وہ ہم لوگوں کے لئے اپنے اِس لازوال قانون میں تبدیلی ہرگز نہ کرے گا۔

ہم اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں۔ کہ جس خدا نے ہمارے لئے اسباب و وسائل مہیا کر کے ہمیں تھوڑے سے کام کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ اُسی نے ہمیں وہ صبر و سکون بھی (جو ہر کام کرنے والے کے لئے ضروری ہے) مرحمت فرمایا ہے۔ ہم اپنی جانب سے کسی سے اُلجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور اپنے کرم فرماؤں کی تعریض و نکتہ چینی سے بھی (خواہ وہ کسی رنگ میں کیوں نہ ہو) صرف اپنی اصلاح و فلاح کا فائدہ اٹھانا چاہیں گے اور بس ع

بادہ گر خام شود پختہ کند شیشۂ ما

"تاجور" چیف ایڈیٹر

اردو مرکز لاہور

۷۸۶

مقدمہ

افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ

افسانہ نگار، صحیح معنوں میں، قصہ گو کا موروثی جانشین ہے۔ اسوقت سے بھی پہلے جب دنیا کا کوئی افسانہ اوّلیں مرتبہ کسی لوح یا بھوج پتر کی ناہموار سطح پر لکھا گیا تھا۔ داستان گو اپنے دیوتاؤں کی سحر آفرینیاں قومی محسنوں کے اولوالعزمانہ کارنامے اور آباد اجداد کی شجاعت و جلال کے قصّے سُنا سُنا کر نبرد آزماؤں کی ہمتیں بندھانا اور اُنکے حوصلے استوار کرنا اپنی زندگی کا اہم ترین مقصد تصوّر کرتا تھا۔ اس نوع کے بے ربط، غیر مسلسل اور تنقید و تبصرہ سے بے نیاز افسانے ابتدائے آفرینش سے ہر ملک اور ہر قوم میں رائج تھے خواہ وہ قوم منطقہ شمالی، منطقہ حارہ یا منطقہ باردہ جنوبی میں بستی یا پہاڑوں کی فلک شگاف چوٹیوں پر رہتی، وسیع مرغزاروں یا دریاؤں کی شاداب وادیوں میں بسر اوقات کرتی تھی انمیں بھی اپنی طرز کے قصّے زندگی کا جزو لاینفک سمجھے جاتے تھے۔ ازمنۂ ماضیہ میں جب انسان ایک درندہ سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا، جبکہ اس میں تن پوشی کی بھی اہلیت نہ تھی۔ چلچلاتی دھوپ کے دوپہر اور موسم زمستاں کی دشوار گذار راتیں صرف کہانیوں ہی سے بسر کی جاتی تھیں[1]۔

[1] دی شارٹ سٹوری۔ پروفیسر برینڈر میتھوز۔

ہمارے پیشروؤں کے نزدیک دنیا غیر معمولی طاقتوں، مخفی اشیا اور مافوق الفطرت ہستیوں سے معمور تھی اور ان قیود سے یکسر آزاد جو موجودہ تمدّن نے ہر چیز کی حیثیت وطاقت پر علم طبعیات کی رو سے عائد کردی ہیں۔ اُن کے خیال میں قدرت کی ہر پیداوار اپنے اندر ایک خاص طاقت مضمر رکھتی تھی اور نظامِ شمسی کا ہر سیارہ خدائی صفات کا مظہر تھا اور ہر ایسی حیرت انگیز بات کرنے کی اہلیت رکھتا تھا جسے انکے تصورات اسکی طرف منسوب کرسکیں۔ یہ توہمات وخیالات ماخذ ومصدر تھے۔ ان روایتوں، داستانوں اور کہانیوں کے جو یونان، روما اور مشرقی اقوام میں رائج تھیں[1]۔

سب سے پہلے کہانیاں مصر قدیم میں لکھی گئیں۔ ان پرانی داستانوں میں جو پیدائش مسیحؑ سے چار ہزار برس پیشتر معرضِ تحریر میں آئیں اور جو بعد میں یہودیوں، یونانیوں ہندوؤں اور روما والوں نے پیدا کیں۔ ماخذ و مواد اور ساخت کے لحاظ سے حیرت انگیز مماثلت تھی۔ موجودہ زمانہ کی مختصر افسانہ نگاری بھی اس لحاظ سے داستانہائے پارینہ کی سادگی اور طرزِ تحریر کی خوشہ چینی نظر آتی ہے۔

ہندوستان کی قدیم افسانہ نگاری

ہندوستان کی ابتدائی افسانہ نگاری کے متعلق محققین اور مبصرین کی یہ رائے ہے کہ اسکا زمانہ پانچ سو سال قبل از مسیحؑ سے لیکر اسکے دورِ حیات تک ہے جس میں سنسکرت زبان کی سب سے بڑی دو رزمیہ نظمیں مہابھارت اور رامائن لکھی گئیں۔ وفاتِ مسیحؑ سے لے کر چار سو سال بعد تک کے زمانہ میں

[1] رائیٹنگ دی شارٹ سٹوری۔ ڈاکٹر برگ ایزنویں۔

مختصر افسانہ نگاری کی صنف کی کوئی قابل ذکر تحریر بیان نہیں کی جاتی۔ اسکے بعد سب سے پہلی چیز جو کسی ادبی مورخ کی توجہ اپنی طرف منعطف کرتی ہے وہ قدیم ہندوؤں کی مشہور کتاب جٹاکا یا بدھ مت والوں کی "افسانہائے پیدائش" ہے۔ قریباً اسی زمانہ میں پنچ تنتر لکھی گئی۔ ان کتابوں کے معرض تحریر میں آنے سے ایک ہزار سال بعد کسی نامعلوم مصنّف نے پنچ تنتر کے بعض اہم ابواب و حصص کو نظر ثانی کے بعد "ہت اپدیش" کے نام سے شائع کر دیا[1]۔ ان نتیجہ خیز و سود مند حکایات کے علاوہ کہانیوں کے بہت سے مجموعے لکھے گئے۔ لیکن ان سب سے علیحدہ اور مختلف کتاب ایک شخص سومدیو نامی نے ۱۰۷۰ء میں "کتھا سرت ساگر" کے نام سے لکھی جو اپنے دلنشیں طرز تحریر اور افسانوں کی دلچسپی کے لحاظ سے اس نوع کی سب کتابوں پر فائق سمجھی جاتی ہے[2]۔

گیارھویں صدی میں مسلمانوں نے ہندوستان پر حملے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ اسی وقت سے لے کر اکبر اعظم کے زمانہ تک افسانہ نویسی کا فن معرض التوا میں رہا۔ ۱۵۶۸ء میں شہنشاہ کے ایما سے علامہ فیضی نے طلسم ہوشربا تصنیف

---

[1] بقول پروفیسر میکس مولر کالی داس چھٹی صدی میں ہوا جس نے رگھو ونش۔ کمار سمبھوا ور میگا دت کتب کے علاوہ شکنتلا اور وکرم ورویشی ناٹک لکھے۔ جن میں ہندوستان کے دو قدیم بادشاہوں کے عشق و محبت کی داستانیں درج ہیں۔ ہندوؤں کے مشہور مذہبی نوشتے یعنی پران بھی اسی زمانے میں تصنیف ہوئے جو تعداد میں ۱۸ ہیں۔ پران کے معنی پرانے قصے کہانیاں ہیں چنانچہ ان میں دیوی دیوتاؤں اور رشیوں کے بہت سے فسانے درج ہیں۔

[2] دی گریٹ شارٹ سٹوریز آو دی ورلڈ۔ بیرٹ ایچ کلارک اینڈ میکسم لائبیر۔

کی جس کا جواب آجتک دنیا کی کوئی زبان پیدا نہیں کرسکی ۔ پھر ابوالفضل نے بہار دانش لکھی ۔ اسوقت سے لے کر خاندانِ مغلیہ کے آخری حکمرانوں کے عہدِ حکومت تک کوئی قابلِ ذکر کتاب تحریر نہ ہوئی ۔ اسکے بعد ۱۸۰۱ء میں باغ و بہار اور طوطا کہانی عرصۂ شہود میں آئیں ۔ گل بکاولی ۱۸۱۳ء میں ترجمہ ہوئی اور ان کتابوں پر قدیم افسانہ نگاری کا خاتمہ ہوا ۔

داستان گو

فن فسانہ کے ضبطِ تحریر میں آنے کے بعد بھی قصّہ گوئی کا فن دنیا میں شد و مد کے ساتھ رائج رہا ۔ اور جو ترقی اس نے مشرقی ممالک میں کی وہ اظہر من الشمس ہے ۔ ازمنہ متوسطہ میں بھی داستان گو ایسے ہی خوش آمدید کے مستحق تھے جیسے اس زمانے میں جب بنی نوع انسان کی سب سے بڑی دلچسپی کا مرکز صرف کہانیاں تھیں ۔ بلاشک وہ وقت قصّہ گویوں کے لئے ایک سنہری زمانہ تھا ۔ جب وہ بغداد و دمشق کے پُر رونق بازاروں میں اپنے پیچھے ایک بھاری انبوہ خلائق لئے پھرتے تھے اور جمہور کے اصرار و شوق پر اپنے نہایت دلچسپ اور شاندار قصّے بیان کرتے تھے[1] جس ذوق اور دلچسپی سے اہل شہر، امیر و کبیر، برنا و پیر، ہر قسم اور ہر مذاق کے آدمی انہیں سُنا کرتے تھے ۔ اس سے افسانہ کی اہمیت اور قدر و منزلت کا پتہ چلتا ہے ۔ جو عوام کے دلوں میں اسے حاصل تھی ۔ امیروں، رئیسوں اور صاحب ثروت آدمیوں کے علاوہ بادشاہوں اور دیگر خاندان شاہی کے معزز افراد کے لئے علیحدہ علیحدہ قصّہ گو مقرر ہوتے تھے جو رات کو سوتے وقت انہیں ہر دفعہ ایک نیا افسانہ سناتے اور جسوقت قصّہ سننے والا سو جاتا ۔ قصّہ گو

---

[1] سٹوریز نیو اینڈ اولڈ ۔ ہملٹن ڈبلیو میبی ۔

کے لئے لازمی ہوتا کہ وہ دبے پاؤں وہاں سے چلدے - اس فن کا رواج اگرچہ ہندوستان میں بھی ہوا مگر بہت دیر بعد اور خصوصاً مسلمان فرمانرواؤں کے عہد حکومت میں چنانچہ اب بھی دہلی - حیدرآباد - لکھنو اور بعض پرانے شہروں میں کہیں کہیں پیشہ ور داستان گو پائے جاتے ہیں -

موجودہ مختصر افسانہ نگاری کے موجد

موجودہ مختصر افسانہ نگاری کی ابتدائی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ امر بخوبی ذہن نشین ہو سکتا ہے کہ اس فن کی تربیت و اصلاح انیسویں صدی کے آغاز میں بیک وقت امریکہ اور فرانس میں شروع ہوئی اور نقادانِ فن کی آرا سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایڈگر ایلن پو اس فن کا "موجد" تھا - ۱۸۳۵ء سے پیشتر پو نے اپنی سب سے پہلی کامیاب اور اصول قصہ نویسی کے نقطۂ نظر سے مکمل مختصر کہانی "بیری نائس" لکھی - اس سے پہلے واشنگٹن ارونگ نے ۱۸۱۹ء میں اپنا فسانہ "رپ وان ونکل" شائع کرایا جو اسوقت تو نہیں - لیکن بعد میں عالمگیر طور پر ایک "مختصر افسانہ" تصور کیا گیا اور یہ بھی پو کے اس تنقیدی مضمون کی بدولت تھا جو ۱۸۴۲ء میں اس نے ہاتھارن کی کہانیوں کے متعلق لکھا اور اس مضمون میں واضح طور پر اسبات کا دعوے کیا کہ مختصر افسانہ نگاری قصہ نویسی کی دیگر اصناف سے علیحدہ اور مستقل چیز ہے - ادھر ۱۸۳۰ء میں بلزاک اپنے شاندار لیکن قدرے طویل افسانے لکھکر فرانس میں مختصر افسانہ نگاری کی بنیادیں استوار کر رہا تھا - اگرچہ بلزاک کے یہ تمام افسانے ایک حد تک مختصر افسانہ نویسی کے عمدہ نمونے تھے لیکن پھر بھی اُن میں جامعیت اور وحدت تاثر کی بہت کمی تھی - باوجود ان باتوں کے وہ دو امریکی مصنفین یعنی ارونگ اور ہاتھارن کی اس جدت اور

اختراع میں برابر کا شریک ہے جو انہوں نے مختصر افسانے لکھنے میں ظاہر کی اور جس نے بعد میں ایلن پو کو افسانہ نگاری کی اس صنف جدید کا موجد بننے میں بہت مدد دی۔[1]

موجودہ مختصر افسانوں کا دیگر اصناف میں تنبہ اور اس کی ہر دلعزیزی کا باعث

مختصر افسانہ نویسی نے مختلف اقسام کی ادبیات میں خود اپنے لئے ایک باعزت اور بلند مرتبہ حاصل کرلیا ہے اور اس سے بڑھکر یہ کہ جمہور کے دلوں پر اسکی حکومت قائم ہے۔ اسکی قدر و منزلت کا یہ عالم ہے کہ مصنفین مُنہ مانگی قیمتیں وصول کرتے ہیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ایک مشہور انگریزی زبان کے رسالہ نے اعلان کیا تھا۔ کہ لٹریچر کے انتخاب میں کسی قسم کے خرچ کی پروا نہیں کی جاتی۔ ہم اسی ہزار روپے ایک ناول اور دس ہزار روپے ایک مختصر کہانی کیلئے دیتے رہے ہیں رڈیارڈ کپلنگ انگلستان کا مشہور افسانہ نویس اپنی ہر مختصر کہانی کے لئے پندرہ ہزار روپیہ یا دو روپے فی لفظ کے حساب سے وصول کرلیتا ہے۔ امریکہ کا شہرہ آفاق ہفتہ وار اخبار "دی سیٹرڈے ایوننگ پوسٹ" ہر مختصر افسانہ کے لئے جو اسکے صفحات میں شائع ہو پندرہ سو روپے فی افسانہ سے شاذ و نادر ہی کم ادا کرتا ہے۔[2] ان خطیر رقموں نے بہترین دل و دماغ رکھنے والے مصنفین کی توجہ کو دیگر اصناف ادب سے ہٹا کر مختصر افسانہ نگاری کی طرف نہایت مستعدی سے مائل کر دیا ہے۔ مختصر افسانوں کا اثر سب سے زیادہ ناول پر پڑا ہے۔ ناول

---

[1] شارٹ سٹوری ماسٹر پیسز۔ فرینچ جلد اول۔

[2] دی آرٹ آف سٹوری رائیٹنگ۔ شائع کردہ ہوزیر انسٹی ٹیوٹ آو امریکہ۔

لکھتے وقت مصنّف اتنے طویل تذکرہ میں آرٹ اور ادبیت کو شروع سے لے کر انتہا تک قائم نہیں رکھ سکتا۔ علاوہ ازیں مختصر افسانہ ہر شخص خواہ وہ کتنا ہی مصروف کیوں نہ ہو بہت تھوڑے وقت میں ختم کر لیگا۔ لیکن ناول کے لئے کچھ دن درکار ہیں۔ مختصر افسانوں میں مصنّف جو بات بیان کرنا چاہتا ہے۔ یا جو اثر اپنے ناظر و قاری کے دل پر چھوڑنا چاہتا ہے۔ وہ کام ناول سے سرانجام نہیں پا سکتا۔ اس لئے کہ ایک ہی صحبت میں اسکا ختم ہو جانا دشوار ہے۔ قرونِ اولےٰ یا ازمنہ متوسطہ میں کہانیاں صرف دل بہلاؤ۔ یا وقت گذاری کے لئے تصنیف کی جاتی تھیں۔ لیکن عصرِ جدید میں یہی کہانیاں قوموں کی ترقی و تنزل کا باعث سمجھی جاتی ہیں۔ متمدّن اقوام کی گذشتہ اسّی سال کی تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مختصر افسانہ نگاری نے اخلاقیات و معاشرت میں کتنا انقلاب پیدا کیا ہے۔ انگلستان روس، فرانس، جرمنی اور امریکہ کے آتش نگاروں نے اپنے ملکوں کی سیاسی و معاشرتی گتھیاں ایسے حسن تدبیر سے سلجھائی ہیں جو بڑے بڑے سیاسی مدبر اپنے قلم اور دیگر حیرت فروز شخصیتیں فلک پرواز دماغ یا عظیم المنزلت قائد نوک شمشیر سے بھی نہ سلجھا سکے۔ دنیا کی ہر دلچسپی اب مختصر افسانہ نگاری میں مرکوز و مضمر ہے۔ تجارت و صنعت، مذہب و معاشرت، تہذیب و تمدن، تاثر و حرکت، انسانیت و بہیمیت، رنج و غم، مزاح، خوشی غرضیکہ دنیاوی آسائش و آرام اور تمام ایسے واقعات و حالات جن کا تعلق انسان کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ مختصر افسانہ نگاری میں موجود ہیں۔ یہ اسکی ہر دلعزیزی اور کامیابی کا راز ہے کہ دنیا کے بہترین رسائل و جرائد اسے سب سے عمدہ اور موزون جگہ دینے کو تیار ہیں۔

اردو کی موجودہ مختصر افسانہ نگاری

باغ و بہار، طوطا کہانی اور اسی قبیل کی دیگر کتابوں میں جو افسانے درج ہیں ان میں اور تیرہ سو سال قبل از مسیح کے لکھے ہوئے افسانوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ انیسویں صدی کے ثلث اول میں جب مختصر افسانہ نگاری کا فن علے الترتیب امریکہ، فرانس، جرمنی، روس اور انگلستان میں معراج کمال تک جا پہنچا تھا ہندوستان میں ابھی تک قدیم طرز کی کہانیاں رواج پذیر تھیں حالانکہ انگریزوں کی حکومت اسوقت تک یہاں قائم ہو چکی تھی۔ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے خاتمہ حکومت سے لیکر انگریزوں کے ہاتھ میں زمام سلطنت آنے تک کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں کشت و خون اور جد و جہد کا زمانہ سمجھنا چاہیئے۔ اس عرصہ میں افسانہ نگاری کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوستانیوں نے صحیح معنوں میں انگریزی زبان سیکھنے کا حوصلہ کیا۔ اور اسی زبان کی وساطت سے مختصر افسانہ نگاری کا بیج اس ملک میں بویا گیا۔ غالباً سب سے پہلے بنگال میں مختصر افسانے ترجمہ ہوئے۔ لیکن حیرت ہے کہ اردو زبان میں انیسویں صدی کے اختتام تک بھی انکا رواج نہ ہو سکا۔ اردو مختصر افسانہ نگاری کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس تیس سال کے قریب ہے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان میں مختصر افسانہ انگریزی زبان سے آیا ہوگا۔ مولینا وحید الدین سلیم پانی پتی کا خیال ہے کہ غالباً سب سے پہلے اودھ اخبار میں مختصر افسانوں کے تراجم شائع ہوئے۔ اور بعد میں خود انکے رسالہ معارف میں جسکا ہمنام اب اعظم گڈھ سے شائع ہوتا ہے۔ سید سجاد حیدر یلدرم نے بھی کچھ افسانے لکھے۔ اس لحاظ سے شاید ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہونگے کہ جسطرح دنیائے مغرب میں پو کو مختصر افسانہ

نویسی کا "موجد" کہا گیا ہے۔ سیّد سجاد حیدر اردو زبان میں طرز جدید کے مختصر افسانے لکھنے والے پہلے شخص ہیں۔

اردو زبان میں مختصر افسانہ نویسی نے اس قلیل عرصہ میں جو ترقی کی ہے وہ بیک وقت حیرت انگیز اور یاس افزا بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فرانسیسی افسانہ نگاری تلذذ، حرکت، تاثر، شگفتگی اور بہترین طرزِ نگارش میں کوئی حریف نہیں رکھتی۔ جرمن مصنّفین توہمات و تخیلات اور رومان کی قسم کے مبالغہ آمیز افسانے لکھنے میں گوئے سبقت لے گئے ہیں روس تصوف اور مادیت، سیاست اور قومیت میں اپنا جواب نہیں رکھتا انگلستان اخلاق پسندی کو اپنے افسانوں کا طغرائے امتیاز سمجھتا ہے۔ امریکہ میں کم و بیش یہ سب باتیں موجود ہیں۔ لیکن اقوام عالم کی کوئی قوم افسانہ نگاری کا ایسا اسکول قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی جو تھوڑے الفاظ میں بہت کچھ کہہ دے اور پھر اسطرح کہ کسی جگہ بھی آرٹ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اسپر طرہ یہ کہ شروع سے آخر تک اس میں ایسی آگ بھی موجود ہے۔ جس سے قاری کا دل ایک قسم کا سوز اور تپش محسوس کرے۔ یہ جملہ اوصاف فرانسیسی افسانہ نگاری میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مذکورہ بالا ممالک کے جو افسانے تراجم کے ذریعہ اردو میں منتقل ہوئے ہیں۔ اپنی بہت سی قومی خصوصیات ساتھ لے آئے ہیں۔ اس لحاظ سے ہندوستان کی کوئی دوسری زبان اتنا شگفتہ اور شاندار لٹریچر اتنے تھوڑے عرصہ میں پیدا کرنے کی دعویدار نہیں۔ اسکے ساتھ یہ امر بھی قابل تاسف ہے کہ طبع زاد افسانے لکھنے والوں کا فقدان شدت کے ساتھ محسوس کیا جا رہا ہے۔ اس فروگذاشت سے قطع نظر کر کے جو منشی پریم چند نے اپنے کئی افسانوں

میں ذلیل مسلمان افراد قصّہ (کیرکٹرز) پیدا کرکے ظاہر کی ہے۔ہم بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ اسوقت تک اُردو زبان میں ان سے زیادہ طبع زاد افسانے کسی اور مصنف نے نہیں لکھے۔ طبع زاد افسانوں کی کمی کے دو سبب ہو سکتے ہیں (۱) تعلیم کی کمی (۲) مدیران رسائل و جرائد کا تغافل۔

تعلیم کی کمی کا سب سے زیادہ اثر رسائل و جرائد اور دیگر مطبوعات پر پڑتا ہے۔ جبتک انکی اشاعت زیادہ نہ ہو اچھے افسانے، عمدہ کاغذ اور دیدہ زیب لکھائی چھپائی کی توقع رکھنا بے سُود ہے۔ ہندوستان میں ہر نوع کی کتابیں، اخبار اور رسائل بہت کم تعداد میں شایع ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قلیل اشاعت سے قلیل منافع حاصل ہو سکتا ہے یا کچھ بھی نہیں۔ ایسی حالت میں کسی رسالے کا مدیر مصنّف کو کوئی خطیر رقم پیش نہیں کر سکتا اور جب معقول معاوضہ حاصل نہیں ہو سکتا تو کون دماغ سوزی کرکے ادبیات کے عمدہ نمونے پیدا کرے۔ اسکے ساتھ ہم یہ بھی کہینگے کہ مدیران کے علاوہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس قصور میں برابر کا حصّہ دار ہے۔ محلے میں ایک اخبار یا رسالہ آتا ہے۔ سب اُسے باری باری سے لے کر پڑھتے ہیں۔ یہ علمی دریوزہ گری، ذلت اور گناہ ہے۔ اور قومی ادبیات کی یکسر تخریب کوئی قوم اس زمانے میں ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اسکے افراد اپنی زبان اور ادب کی کماحقہ حفاظت اور مدد نہ کریں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سال بھر میں جس قدر روپیہ کوئی شخص اپنے جسم کی صفائی کے لئے صابن پر خرچ کرتا ہے۔ اتنے ہی روپے کی عمدہ کتابیں اور رسالے نصف عمر کے لئے اسکا دل صاف کر دینگے۔ سطور مندرجہ بالا میں کسی جگہ ضمناً بیان کیا گیا ہے۔ کہ سیٹرڈے ایوننگ پوسٹ ہر افسانے کی اجرت پندرہ سو روپے

کے قریب ادا کرتا ہے۔ یہ صرف اسکی فیاضی یا قدردانی نہیں۔ بلکہ اسکی اشاعت پر منحصر ہے۔ اسکی ہفتہ وار اشاعت پچیس لاکھ سے زاید ہے۔ اور اُردو زبان کا کوئی رسالہ پانچہزار کی تعداد تک بھی نہیں پہنچا۔ ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

طبعزاد افسانے لکھنے والوں کی اس کمی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسوقت اُردو زبان میں تین فیصدی سے زاید اوریجنل افسانے موجود نہیں۔ اور ان میں بھی صرف ایک فیصدی ایسے ہیں جو فن کے نقطۂ نگاہ سے درست اور مکمل ہوں۔ اسکا ایک سبب تو وہی ہے معقول معاوضہ کا حاصل نہ ہونا اور دوسرا افسانہ نگاری کے اصول پر اُردو زبان میں کسی مستقل تصنیف کی عدم موجودگی۔ اسکے ساتھ ہم یہ بھی کہینگے کہ فن صحافت اور افسانہ نویسی سکھانے کے اسکول اور کالج بھی ہونے چاہئیں۔

افسانوں کے انتخاب میں ہمیں یہ تجربہ ہوا کہ ہندوستان کی خاک پاک میں جوہرِ قابل تو موجود ہے۔ لیکن اصلاح اور راہنمائی کی سخت ضرورت ہے۔ اسوقت افسانہ نویسی کے میدان میں بنگال بہت بڑھا ہوا ہے۔ لیکن انکا موضوع بحث توہمات، ارواح خبیثہ اور معاشرت کے دائرہ تک محدود ہے۔ برعکس اسکے اُردو زبان میں ہر قسم اور ہر نوع کے افسانے مل سکتے ہیں۔ جسکا ثبوت آپکو اس سلسلۂ منتخبات میں ملیگا۔ اردو زبان کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ جہاں بنگالی اور ہندی افسانوں نے اپنی قومی خصوصیات پیدا کرلی ہیں۔ اردو میں یہ بات قطعاً موجود نہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد، مولینا راشد الخیری، مولینا شرر۔ پنڈت سرشار اور دیگر مشاہیر اہل قلم کے ناولوں، قصّوں یا افسانوں میں قومی رنگ ضرور موجود ہے لیکن

وہ تمام مطول افسانے ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہیں۔ اس سلسلے میں جن اصحاب نے کم و بیش خدمت سرانجام دی ہے۔ ان میں سید سجاد حیدر منشی پریم چند حکیم احمد شجاع اور سدرشن کا نام سب سے پہلے ہے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ اول الذکر کے افسانوں میں علے الترتیب ترکی اور انگریزی اور ثانی الذکر کے قصوں میں بنگالی اور ہندی رنگ زیادہ جھلکتا ہے۔

سر رچرڈ سٹیل نے ایک دفعہ کہا تھا کہ نہ صرف شاعر بلکہ افسانہ نگار بھی پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا۔ ہمیں اس توضیح سے قدرے اختلاف ہے۔ صرف ذکاوتِ طبع ہی پر قانع ہونا درست نہیں۔ قابلیت اور تربیت بہترین افسانہ نگار بنا دیتی ہے۔ اسی مسئلہ پر مارک ٹوین جیسا شہرۂ آفاق افسانہ نویس اپنے ایک نوجوان دوست کو نصیحت کرتا ہوا لکھتا ہے۔ دنیا داروں کی کامیابی کے لئے ایک غیر مرقوم قانون ہے اور تمہاری ہمشیرہ کو اس قانون کے سامنے گردن خم کرنی چاہیئے۔ مختصراً وہ قانون یہ ہے:۔

(۱) کوئی ملازمت بغیر امید واری کے نہیں۔

(۲) امیدوار کے لئے کوئی تنخواہ نہیں۔

یہی قانون اس ادنےٰ سپاہی کی راہ میں سد سکندری کی طرح حائل ہے۔ جو بارود کی بو سونگھے بغیر جرنیل بن جانے کی موہوم امید پر جی رہا ہو۔ اور یہ ہر اس شخص کے راستے میں حائل ہوتا ہے (اور اسے حائل ہونا چاہیئے) جو ملازمت اور تنخواہ کا مطالبہ کرتا ہے بغیر امیدواری کئے اور بغیر اس بات کو ثابت کئے کہ وہ اس ملازمت کے ہر طرح قابل ہے"۔

ہندوستان کا ہر مصنّف اور افسانہ نگار اپنی پہلی کوشش کو ملک کے بلند پایہ رسائل کی زینت بنانے کا آرزومند ہے اور اسکے ساتھ معقول

معاوضہ کا طالب۔ یہ غلطی ہے۔ اور آج تک دنیا میں کہیں ایسا نہیں ہوا۔ مبتدی افسانہ نویس حیران ہیں کہ کیوں رڈ یارڈ کپلنگ کو ہر مختصر افسانے کے لئے ایک ہزار پاونڈ معاوضہ دیا جاتا ہے۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ وہ اپنا ہر افسانہ اور ناول جب تک کہ اس کی کامل و مکمل طور پر پرورش اور تربیت نہ ہو لے۔ ہرگز زینت اوراق جرائد ہونے کے قابل نہیں سمجھتا۔ اور شاید یہ بات مبتدیوں اور منتہیوں کے لئے سبق آموز ہو سکے۔ کہ کپلنگ اپنا ہر افسانہ کم از کم چھ سے آٹھ دفعہ دوبارہ لکھتا ہے۔ اور اسی سعیٔ پیہم سے اپنے قصّوں کو ایک ہیرے کی طرح تراش کر جمہور کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جس سے ہر قاری کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو جائے۔

اصول انتخاب

افسانوں کے انتخاب میں ہمیں بہت حد تک ایڈورڈ جے اوبرائن کے قائم کردہ اصول کا تتبع کرنا پڑا۔ یعنی وہ افسانے اس سلسلے میں منتخب کئے گئے ہیں جو (۱) بلحاظ اپنے واقعات کی ترتیب اور افراد قصہ کی جدّت و اختراع کے عمدہ تھے یا (۲) طرز نگارش کے لحاظ سے اس قابل تھے کہ انہیں اس مجموعے میں شامل کیا جاتا یا (۳) جن میں دونوں اقسام کی بیان کردہ خوبیاں موجود تھیں۔ افسانوں میں واقعات اور حالات اس خوش اسلوبی سے ترتیب دینے چاہئیں کہ پڑھنے والا جھوٹ سمجھتے ہوئے بھی سچ ہی باور کرے۔ اور محسوس کرے کہ اشخاص افسانہ کی عروق میں حقیقی زندگی کا خون دوڑ رہا ہے۔ اس قسم کے افسانے جن میں سوز و التہاب یا تاثر و حرکت مفقود تھی۔ ہم نے عمداً نظر انداز کر دئے ہیں۔ خواہ ان کا لکھنے والا آسمان صحافت کا کوئی تابناک ستارہ ہی کیوں نہ تھا۔ دوسرے اصول انتخاب کے تحت ہم نے صرف وہی افسانے لئے ہیں۔ جن میں واقعات کو تو اس ہنر و خوبی سے ترتیب

نہیں دیا گیا۔ لیکن وہ ایسے اہم اور دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ کہ پڑھنے والے اور نقاد کے دل پر ایک خاص اثر پیدا کریں۔

طریقہ ترتیب ابتدا میں خیال تھا کہ افسانوں کو مندرجہ ذیل اقسام میں منقسم کیا جائے :۔

(۱) قصص جن کی بنیاد انسانیت پر ہو

(۲) قصص جو فطرت اخلاقی پر مبنی ہوں۔

(۳) قصص جو پیشہ وری پر مبنی ہوں۔

(۴) قصص بدوی و حضری۔

(۵) قصص جن کی بنیاد تحیر پر ہو

(۶) قصص جن کی اساس معاشرت پر ہو۔

(۷) قصص جن کی بنا تحریک جذبات پر ہو۔

لیکن بعد میں اس طریقہ کار کو مجبوراً چھوڑ دینا پڑا۔ اولاً اس لئے کہ اردو زبان میں ان تمام اقسام کے ماتحت افسانے نہیں لکھے گئے۔ ثانیاً اس وجہ سے کہ بالفرض قصص تحیر کو یکجا جمع کر دیا جاتا۔ تو وہ پڑھنے والے کے لئے بجائے دلچسپی کے ذہنی اضمحلال کا باعث بن جاتے۔ اسی صورت کو مدنظر رکھتے ہوئے کوشش کی گئی ہے۔ کہ ہر جلد میں جہاں تک ممکن ہو۔ مختلف انواع کے افسانے شامل کئے جائیں۔ تاکہ وہ مختلف رنگوں اور متفرق اقسام کے پھولوں کا ایک بیش بہا گلدستہ بن جائے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے۔ کہ افسانوں کو ترتیب دیتے وقت افسانہ نگاروں کی ترتیب کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ مثلاً آپ دیکھیں گے۔ کہ اگر سجاد حیدر یا نیاز فتح پوری کا کوئی افسانہ کسی جلد کے شروع میں درج ہے

تو کوئی کسی جلد کے اخیر میں بھی نظر آئے گا۔ اس ترتیب میں افسانوں کی خوبیوں یا مصنفین کے حفظ مراتب کا خیال رکھنے کی بجائے ناظرین کی دلچسپی کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

ایک گذارش ان افسانوں کے انتخاب یا جمع کرتے وقت عام طور پر طرز عمل یہ رہا ہے کہ نکتہ چین اور نقادوں کو خوش کرنے کی بجائے پڑھنے والے کی دلچسپیوں میں معتدبہ اضافہ کیا جائے۔ اور ہماری یہ دلی آرزو ہے۔ کہ عامۃ الناس ان افسانوں کو حظ و انبساط کے لئے پڑھیں۔ اور غور کریں کہ لائق مصنفوں نے اخلاقی، معاشرتی، تعلیمی اور اقتصادی مسائل کو کس حسن و خوبی اور قابلیت سے حل کیا ہے۔ اس کے ساتھ سر فلپ سڈنی کے اس مقولے کو بھی نظر انداز نہ کریں۔ کہ "یہ ایسی کہانیاں ہیں جن کی دلچسپی اور دل آویزی بچوں کو کھیل سے اور بوڑھوں کو گوشۂ تنہائی میں جانے سے روک دے"

اعتذار اس مختصر سے مقدمے کو ختم کرنے سے پہلے اس بات کا اعلان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں ایک مصحح کی عقلمندی سے جو بزعم خویش اس فن کے بہت بڑے ماہر تھے۔ دو تین ایسے افسانے بھی درج ہو گئے ہیں۔ جو قابل التفات نہ تھے۔ اور ہمیں اس بات کا اس وقت علم ہوا۔ جب بہت سی کاپیاں چھپ چکی تھیں۔ اور ایسی حالت میں ان کا نکال دینا بہت بڑے مالی نقصان کا باعث تھا۔ ان افسانوں کو طبع ثانی میں یکسر خارج کر دیا جائیگا۔ اسکے علاوہ وہ دو گذاشتیں جن کا اتنے بڑے کام میں رہ جانا ناگزیر ہوتا ہے۔ وہ بھی دور کر دی جائینگی۔

تصاویر افسانہ نگاروں کی تصاویر حاصل کرنے میں باوجود سعی پیہم کے ہمیں متوقع کامیابی نہیں ہوئی۔ کیوں کہ افسانہ نگاروں کی "میں کس قابل ہوں" "میں کیا اور میری تصویر کیا" نے اِس سلسلہ منتخبات کو کئی قابل ذکر افسانہ نگاروں کی تصاویر سے محروم کر دیا۔

امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن تک ہم ان اہل قلم کو یہ ذہن نشین کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کہ وہ اور ان کی تصویر اس قدر از کار رفتہ نہیں ہیں۔ کہ دنیا اپنے متعلق ان کے سوء ظن میں ان کی ہمنوا بن جائے۔

منتخب افسانوں کے مجلدات کا یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ باقی مجلدات میں جو زیر ترتیب ہیں۔ وہ قابل قدر افسانے جو اِن مجلدات میں شائع ہونے سے رہ گئے۔ درج کئے جا رہے ہیں۔

کارکنان اردو مرکز

فہرست جلد اوّل

نمبر شمار	فسانہ	فسانہ نگار	صفحہ
۱	گمنام خطوط	سیّد سجاد حیدر یلدرم بی اے رجسٹرار مسلم یونیورسٹی۔	۱
۲	نمک کا داروغہ	منشی پریم چند بی اے۔	۱۸
۳	دل دینا	علامہ عبدالحلیم شرر لکھنوی	۳۱
۴	سدا بہار ٹاپو کا ہندی	مولینا عبدالمجید سالک بی اے مدیر "انقلاب"	۳۷
۵	ایثار	شیخ محمد ضیاء الدین شمسی جرنلسٹ	۵۱
۶	کنول کی بیٹی	پنڈت بدری ناتھ سدرشن جرنلسٹ	۸۳
۷	اندھا دیوتا	حکیم احمد شجاع صاحب بی اے اسسٹنٹ سیکرٹری پنجاب لیجسلیٹو کونسل	۸۸
۸	تولہ بھر ریڈیم	حضرت مولینا ظفر علیخاں بی اے مدیر "زمیندار"	۱۰۸

گمنام خطوط

(از جناب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم بی اے رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

(خورشید لقا بیگم کا خط اپنے بہنوئی کے نام)

میں للت پور جا رہی تھی، رات تاریک تھی، اور ٹرین کے انجن کا کثیف دھواں اس تاریکی کو کچھ کم نہیں کر رہا تھا، بڑھا ہی رہا تھا۔ اس عظیم الشان اور وسیع تاریکی میں، گاڑی کی کھڑکیوں میں سے نکلنے والی روشنی نے ٹرین کو ایک چمکدار اور تیز رو ہزار پاکیڑا بنا رکھا تھا جو بل کھاتا ہوا جا رہا ہو۔ اس محیطِ حزن و خوف میں میرے لئے ایک عجیب کشش تھی، میں بار بار سر نکال کے اس تاریکی پر نظر ڈالتی تھی اور میرا دل چاہتا تھا کہ اس میں غائب ہو جاؤں۔ میں اسٹیشن پر پہنچی، مگر وہاں میرے لینے کے لئے کوئی نہ تھا، میں جس طرح تمہیں اطلاع دئے بغیر لکھنو سے روانہ ہو گئی تھی، اسی طرح بغیر کسی اطلاع کے یہاں پہنچی تھی۔ میں نے چاہا کہ اپنے شوہر سے اچانک جا ملوں۔ بالفرض اگر میں اس تاریکی میں غائب ہو جاتی، تاکہ اُس فجیعۂ حیات کو جسے تنہا میں ہی محسوس کرتی ہوں ختم کر دوں، اور اپنے دل کی حسرتوں، اپنی رُوح کی تڑپ کو اپنے ہی ساتھ خاموشی سے لیجاؤں، تو کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ میں کہاں غائب ہو گئی اور کیونکر غائب ہو گئی میں ایک عورت ہوتی جو ایک راز، ایک معما کی طرح بغیر حل ہوئے رہ جاتی یہ ایک ایسا محبوب خیال تھا کہ اگر میری لڑکی کی سیاہ آتشیں آنکھیں ابدیاً میرے لئے روتی

ہوئی، انتظار کرتی ہوئی، میرے تخیل کے سامنے نہ آجاتیں تو میں اس ارادے کو پورا کر گذرتی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ کچھ دنوں کے بعد مجھے اپنے وطن سے، ایک راز، ایک معما کی طرح غائب ہونا ہی پڑیگا۔

انسان اپنے مستقبل کے مقابلہ میں کس قدر عاجز و ناتواں ہے، اُسے نہیں معلوم ہوتا کہ اگلے چند دن، یا چند گھنٹے زندگی کی مصیبتیں، کیسی فلاکتیں یا کیسی خوشیاں، کیسی مسرتیں اپنے میں چھپائے ہوئے ہیں۔ اگر آئندہ کے پنہاں صدمات، یا تبسم تجلیات کی ہمیں خبر ہو جائے، تو ہم شاہراہ حیات پر اس طرح اپنے کو راہ چلے جانے پر کیسے ہنسیں۔ اگر اس وقت اپنی خواہش کے مطابق میں اپنے تئیں ٹرین کی کھڑکی سے نکال کے اُس فضائے تاریک میں پھینک دیتی تو آج کے دن اس تلخ کامی کے احساس سے بچ جاتی، مگر جس قسمت نے اس اعتنا کے ساتھ مجھے اس جال میں پھنسایا تھا، کیا وہ اپنے کھلونے کو آسانی سے اپنے ہاتھ سے جانے دیتی؟ ہرگز نہیں، غرضکہ وہ سیدھی مجھے اُس گڑھے میں لے گئی، جس کی طرف مجھے اپنی بیٹی کی سیاہ اور خوبصورت آنکھیں کھینچ رہی تھیں۔

میں گھر پہنچی، مگر ماجد کو میں نے گھر میں نہ پایا، وہ دورے پر باہر گیا ہوا تھا میری لڑکی اپنی سیاہ چمکیلی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھرے ہوئے مجھ سے آ کر لپٹ گئی، میری ساس نے اپنی حلیم و شفیق نظریں اُٹھا کر مجھے دیکھا، مگر ان نظروں میں تجسس اور شبہ ملا ہوا تھا، اُسکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں گئی تو تھی تین مہینے کے لئے اور ڈیڑھ مہینے ہی میں واپس آگئی، اسکی کیا وجہ تھی۔ پھر بے خبر اچانک آنا کیا معنی رکھتا تھا، میرا "بچی اور ماجد کے دیکھنے کو دل چاہا، کہنے پر اُس نے نیم محزون، نیم مستہزی آواز سے کہا:۔

"ہاں ضرور تمہاری اور ماجد کی ایسی ہی اچھی طرح تو گذرتی ہے کہ میں یہ سمجھوں کہ تم

اُس بغیر نہیں رہ سکتیں۔

اُسے یہ کہنے کا حق تھا۔ ہماری تیرہ برس کی زندگی ایک ناجعۂ مدید تھی، جس میں ناقابلِ بیان دردانگیز واقعات ظہور میں آئے تھے۔ اس زندگی کی یگانہ شاہد اُسکی ہمدرد و رحیم آنکھیں تھیں اُسے یقین نہ آتا تھا کہ لکھنؤ کی زندگی چھوڑ کر میں اس شخص کیلئے، گو وہ اُس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، دَوڑی دَوڑی آؤنگی، خود وہ جب کبھی لکھنؤ جاتی تو ہفتوں کی بجائے مہینوں ہاں ٹھیرتی، اور گو اپنے بیٹے سے جُدا ہو کر گئی تھی پھر بھی لوٹتے وقت کہتی۔

"میرا سر پھرا تھا جو میں یہاں آئی"

رُوحاً و فکراً جس آدمی سے مجھے کوئی مناسبت نہ تھی میں اُسکی ہر زیادتی اور سختی کا سکون و بردباری سے مقابلہ کرتی تھی، اُسکے سب و شتم کا کبھی میں نے جواب نہ دیا، اپنے خاندان اور اپنے عزیزوں میں ہمیشہ بشاش چہرہ ظاہر کرنے کی کوشش کی، میری ساس اس کوشش پر عزت آمیز شفقت کی نگاہ ڈالتی تھی مگر اُسے یہ خبر نہ تھی کہ ایک عورت جس مرد سے اس قدر بیزار ہو کہ اپنی موت کی دُعائیں مانگا کرے، جس مرد نے تیرہ سال تک اُسے ستایا ہو، اُسکی زندگی بے مزہ و بے رنگ کر رکھی ہو، اُس عورت کی زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ وہ عورت، اُس مرد کو ناقابلِ دفاعت کشش سے چاہتی ہے۔

شام کا وقت تھا کہ بنگلے کی برساتی میں ایک دَوڑتے ہوئے گھوڑے کی آواز آکر رُکی میں اور میری بیٹی سرلقا، دَوڑ کر دروازے تک گئے۔ ماجد نے اپنا گھوڑا سائیس کو دیا، اُسکے ہاتھوں میں جھریاں تھیں، اُسکی سیاہ آنکھیں اندیشہ ناک تھیں، اپنے بازوؤں کو جسکی گوشت کی پھڑک کو میں نے ہر وقت ایک عجیب جاذب خوف سے دیکھا تھا اُس نے کولھوں پر گرا دیا، اور ایک مغموم طریقے سے وہ کمرے

میں داخل ہُوا۔ اُسکی پہلی نظر مجھ پر پڑی، میں اس وقت لکھنؤ کے تازہ ترین لباس میں ملبوس تھی جس سے وہاں کی فسوں دلبری برس رہی تھی اُسکے چہرے پر ایک فوری اور لطیف تغیر پیدا ہُوا۔ اُسکے بعد اپنے بھاری جسم کو ہلاتا ہُوا ایک دلدوز آواز سے وہ میری طرف لپکا، اور اُس نے اپنی سیاہ اور محترص آنکھوں سے دیوانہ وار میرے چہرے کو دیکھا، پھر اپنی کرخت آواز کو نرم کرنیکی کوشش کر کے مجھ سے کہنے لگا:۔

"خورشید! تمہارا دل میرے دیکھنے کو چاہا تھا نہ؟ لکھنؤ سے اس قدر جلد چلی آئیں، یعنی لکھنؤ اور لکھنؤ والوں سے زیادہ ہمیں چاہتی ہو؟"

یہ باتیں بالکل قدرتی تھیں، مگر میں نے خیال کیا کہ اس میں کوئی معنی پنہاں ہیں، اور اس لئے مجھے ان باتوں سے خوشی ہونیکی بجائے تھوڑی سی تکلیف ہُوئی لیکن اس میں کیا تھا؟ میں سوچتی تھی کہ اس دماغ میں جو صرف مادّہ اور ہوس سے پُر ہے، اور کوئی گریزاں شُبہ بھی پھر رہا تھا۔

پہلے دو تین دن تو ہم نے ایک نوخیز عشق کے غشی آور جوش میں گذارے، کمرے پر پردے گرا دیئے گئے، لانگ بوٹ اور وردی اُتار کے پھینکدی گئی، یہانتک کہ جب اُسے خبر دی گئی کہ اُسکی محبوب گھوڑی، تھان پر بندھے شرارت کر رہی ہے، تو اُس نے اپنے چوڑے سینے کی تمام قدرتِ وسعت کو کام میں لاکر گرج کے کہا:۔

"جاؤ، ہنٹو، اگر پورے ضلع کو ڈاکو لوٹ مار کر کے تباہ کر دیں، تو بھی میں فی الحال ٹس سے مس ہونے والا نہیں ہوں۔ کرچ یہاں سے اُٹھاؤ، وردی کو میرے سامنے سے ہٹاؤ، اماں جان سے جس نے مجھے بھیجا ہے میری طرف سے کہو کہ میری بیوی کو آئے ابھی تین دن ہی تو ہُوئے ہیں، ایک ہفتہ تک سب انہیں کے

سپرد ہے چلو" کوئیک مارچ" یہ کہکر گلشن آیڈ کو جو ایک مضحک خوف سے اُلٹے پاؤں جارہی تھی، ماجد نے نکالا اور دروازہ بند کر دیا، اسکی عمر ۳۸ سال کی تھی مگر اُسکے دل اور جسم کی طراوت دس سال پہلے کے شباب کو یاد دلاتی تھی، آج بھی وہ ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسا کالج سے تازہ تازہ نکل کے فوراً ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مقرر ہونے اور میرے ساتھ بیاہے جانے کے وقت تھا، مگر اب میں وہ لڑکی نہ تھی جو بیاہ کے بعد اُسکے گھر میں آکر اُسکی روشن آنکھوں پر عاشق ہوگئی تھی، میری روح، حسیات کے وسیع و مُغلق فضا میں میرے شوہر کو جو مجھ سے عمر میں صرف پانچ برس بڑا تھا، حساً ایک بچّہ چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی، مگر یہ ماننا پڑیگا کہ یہ شخص جو اپنی بعض اوقات تحمل فرسا گرمجوشی سے مجھے اُکتا دیتا تھا میری زندگی کے لطیف ترین و شیریں اوقات کا بھی باعث ہُوا تھا، مگر اس دفعہ اس گرمجوشی نے (جس کی میں عادی تھی) معمول سے زیادہ طول کھینچا، میں نے خیال کیا کہ اس کی تہ میں ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے، میں جانتی تھی کہ یہ آدمی جو مجھ سے کوئی بات چھپانے پر متقدر نہیں ہے، ضرور مجھ سے سب حال کہیگا، میرا اندازہ غلط نہ نکلا، لکھنئو سے واپس ہُوئے، مجھے تین دن ہُوئے تھے، چاندنی رات تھی، ماجد کمرے میں کھڑکی کے پاس متفکر و ساکت بیٹھا ہوا تھا، میں سونے کی کوشش کر رہی تھی، کہ وہ اپنی کرسی گھسیٹ کے میرے پلنگ کے قریب آیا، اور میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کے اپنے ہونٹوں تک لے گیا اور متردد اور کچھ کچھ محجوب آواز سے کہنے لگا: "مجھے معاف کرو گی؟"

میں نے خیال کیا کہ میرے لکھنئو کے زمانۂ قیام میں اس نے یہاں کوئی حرکت کی ہے، اُسکے لئے معافی مانگ رہا ہے، نوازش آمیز طریقے سے میں نے

اُس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں سے دبایا، وہ اپنے سامنے نظر گاڑ کے کہہ رہا تھا،
"مجھے تمہاری طرف سے کچھ شبہ تھا، گو اپنے سے زیادہ مجھے تم پر اعتبار تھا لیکن میں نے ایک مہینہ اس قدر رشک کے جذبات میں گذارا کہ میں قریب قریب پاگل ہو گیا تھا"
میرے دل میں ایک ٹھٹھر سی پیدا ہوئی، میں نے تجسس کے ساتھ پوچھا
"کس باعث اور کیوں؟"
"اگر میں کہوں تو مجھے معاف کر دو گی؟"
"اس کا میں وعدہ نہیں کرتی، کیونکہ میں کوئی وجہ نہیں دیکھتی کہ تم مجھ پر شبہ کرو"
"سچ کہتی ہو خورشید! مگر اُن خطوں میں اس خاص لفظ پر اس قدر اصرار تھا کہ"
"کون، خطوط، اور کیسے لفظ؟"
"چند گمنام خطوط تھے، مجھ جیسے سپاہی آدمی کا ایسے کمینے اور بزدل لوگوں کی تحریروں پر اعتبار کرنا جنہیں اپنے دستخط کرنے کی بھی ہمت نہیں، بے شک قابلِ ملامت ہے مگر میں نے اُن تمام خطوط کو جلا دیا، اور میرا سارا اضطراب اور شبہ تمہارے چہرے کو دیکھ کر جاتا رہا"
میری پہلی آرزو یہ سُن کر یہ ہوئی کہ مجھے معلوم ہو، ان گمنام خطوں میں میرا نام کس کے ساتھ لیا گیا ہے، مگر نہ معلوم کیوں، کسی خیال نے میری زبان پکڑ لی اور میں نے کچھ نہ پوچھا، کیا وہ نام تمہارا تھا؟ مگر کیوں اور کس لئے؟ میں نے اپنے ضمیر کے سب سے پوشیدہ کونوں میں نظر ڈالی، مجھے کوئی ایسا لمحہ، یا کوئی ایسا لفظ یاد نہ آیا جو کسی مشکل پسند ضمیر کے نزدیک بھی قابلِ اتہام ہو، یہ بھی

نہیں کہ اپنے یا اپنے شوہر کے عزیزوں میں صرف تم ہی وہ مرد ہو جس سے میری ملاقات ہو، میرے شوہر کے ایک چچازاد بھائی ہیں، جو خود بڑے عہدہ دار ہیں، اُن کا میری طرف اس قدر رجحان ہے، کہ اگر میں ایک سیاست داں کی ترکیبوں کو استعمال نہ کروں تو وہ مجھ سے ہر وقت اس قدر بے تکلف ہونے پر آمادہ ہیں کہ وہ یہ بھی بھول جانا چاہتے ہیں کہ میں اُنکے بھائی کی بیوی ہوں، میرے چچا کا ایک بیٹا ہے جو میرے بیاہ سے پہلے دو برس تک متواتر میرا طلبگار رہا، اور مجھے سو جان سے چاہتا تھا، اُسے بھی میں نے ترکیبوں سے عاشقی کے راستے سے ہٹا کر برادرانہ دوستی کی راہ پر ڈالا۔ اب ہم دُنیا میں دو سب سے اچھے اور صمیمی دوست ہیں، مگر تم! تم سے تو کبھی پاک وصاف بھائی چارہ اور دوستی کے حدود سے سرِمو تجاوز نہیں کیا گیا، اور تمہاری نگاہوں میں مَیں نے کبھی اخوت کی شفافیت کے سوا کوئی اور جھلک دیکھی ہی نہیں۔

مگر کیوں اس وقت سب سے پہلے میرے ذہن میں تمہارا نام آیا؟ میں پچھلی دفعہ جب لکھنؤ میں تھی تو میں نے اعزا و احبا کی نظروں اور اطوار میں کچھ عجیب و غریب اشارے پائے، خاصکر میری قمر زمانی کی مغلانی حسینی خانم کی باتیں عجیب تھیں میں اپنی ابتدائے زندگی سے دیکھ رہی ہوں کہ اس بڑھیا کی کوشش رہتی ہے کہ یہ ظاہر کرے کہ مجھے اپنی چھوٹی بہن کی زندگی پر رشک ہے۔ آج سے پانچ سال پہلے، جب تم قمر سے نئے نئے بیاہے گئے تھے، اور میں تمہارے باسلیقہ و خوبصورت گھر میں اپنی بہن سے ملنے گئی تھی اس بڑھیا نے یہی خیال ظاہر کیا تھا۔ کہنے لگی:-

"بیٹی! مفصلات میں بھلا تمہیں ایسی خوبصورت کوٹھی رہنے کو کہاں ملتی ہوگی؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے"

"بیٹی تمہاری بھی قسمت کیسی خراب نکلی، کیا اچھا ہوتا تمہیں رشید جیسا مشہور شاعر ملتا جو محض شاعر ہی نہیں پوتروں کا امیر بھی ہے، وہ قمر کے نصیبے میں لکھا تھا جسے پڑھنے لکھنے یا شعر شاعری کا ذرا بھی شوق نہیں، تم جو بچپن سے کتابوں کا کیڑا رہی ہو، تمہیں ایک پولیس والا ملا ہے جسے کود پھاند کے سوا اور کچھ نہیں آتا"

"میں اپنے اکھڑ پولیس والے سے خوش ہوں، مجھے شاعر نہیں چاہیئے"

"خدا تمہیں خوش رکھے بیٹی، مگر رشید صاحب کی نزاکت و نفاستِ مزاج ایسی ہے کہ اُسے چاہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ وہ ہر وقت اپنی بیوی کی دلجوئی کا خیال رکھتا ہے"

"یہ مانا میرا پولیس مین ایسا نہیں، مگر قمر کی خوش بختی ہے"

بی مغلانی میرے دل میں حسد پیدا کرنیکی ناکامیابی سے کچھ کھسیانی سی ہو کر رہ گئیں، تھوڑی دیر بعد قمر اپنا حسین مگر بھولا چہرہ لئے آئی۔ اُسکی آنکھوں سے نورِ مسرت کی شعاعیں نکل رہی تھیں جسے دیکھ کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ بی مغلانی کی کوششوں کے باوجود میں اور قمر ایک دوسرے کو اتنا سمجھتے ہیں کہ ایک دوسرے کی خوشی و رنج میں پوری طرح شریک ہوتے ہیں۔ اُس دن قمر مجھے سناتی رہی کہ تم اُسے کتنا چاہتے ہو، میں نے اُس کی محبت کو محسوس کیا، ایک صمیمی، عمیق و وفا کار شفقت! تم میری چھوٹی قمر کے آرام کے لئے، اپنی شخصیت کو بالکل برطرف کر دیتے ہو +

اب جو تم گھر میں آئے، تو شائد صبح کی گفتگوؤں کا نتیجہ تھا یا کیا، میں بلا ارادہ اپنے دل میں اپنی زندگی اور ماجد کا تم سے مقابلہ کرنے لگی۔ مجھے نظر آیا کہ

گو ماجد بھی مجھے دیوانہ وار چاہتا ہے مگر اُس کی محبت مادّی ہے۔ تمہارا عشق قمر کے ساتھ ایک حمایہ کار، نزیہ محبت کی شان لئے ہُوئے ہے۔ ان دونوں محبتوں میں مجھے وہ فرق نظر آیا، جو دوزخ اور بہشت میں ہے۔ تم قمر کو اسکی آرزو کے خلاف کھونٹتے نہیں، ذرا ذراسی باتوں پر ستاتے نہیں، ساتھ ہی اس کے تمہاری محبت میں ماجد کا سا طوفان، جوش و خروش یا مردانہ مستانہ پن نہیں ہے، ممکن ہے اس بات پر، قمر کی سکونِ حیات و مسرت منور پہ مجھے تھوڑا سا خبط ہُوا ہو، مگر مجھے اس کی خوشی سے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ میں کہہ سکتی ہوں نہیں ہُوا، میری زندگی کے لئے تو شاید یہ مقدرات میں سے ہے کہ ہمیشہ وہ طوفان میں سے گذرے، مجھے ایسا سکون ملتا جیسا تمہارے گھر میں ہے، یقیناً وہاں بھی طوفان شروع ہو جاتا، جیسا میں نے ابھی کہا یہ میرے مقدرات میں سے ہے۔

قمر میں کس قدر تغیر ہو گیا تھا، میں نے دیکھا کہ ایک عالی روح۔ اور عالی فکر نے اپنی تمام خصوصیات اُس میں القا کر دی تھیں، اور عشق کے موقلم نے اپنا رنگ اُس کے حِس اُسکے فِکر میں بھر دیا تھا، شام کو جس وقت تم اُسے اپنے اشعار، یا اپنے مجوّزہ تصانیف کے خاکے یا قِصّوں کے پلاٹ . . . . سناتے تو وہ سمجھنے والی اور سمجھ کر داد دینے والی نظروں سے تمہیں دیکھتی تم قمر میں سرتا پا حلول کر گئے تھے، تم بھی قمر کی ہر حرکت کو مشفق و مدقق نظر سے دیکھتے تھے، میں متبسمانہ اپنے دل میں ماجد کا خیال کئے بغیر نہ رہ سکتی تھی، وہ مجھ سے کہا کرتا تھا "میں تمہارے زلف عنبر بیں کے ایک ٹوٹے ہُوئے بال کے بدلے میں تمہارے سارے افکار و اشعار کو نہ لوں"۔

حالانکہ تم نے قمر کے تنویرِ دماغ کے لئے اُسکے معمولی بالوں کی پروا نہیں

کی، اسکے بعد مجھ میں اور تم میں ایک رابطۂ دوستی شروع ہوگیا۔ اس دوستی کی اس خصوصیت میں کبھی فرق نہ آیا کہ وہ اتحادِ خیالات کی دوستی تھی، میں نے اپنے تخیلات وحسیات کی دُنیا میں تمہیں اپنا شریک پایا، مگر یہ تخیلات و حسیات وہ تھے جو دو مرد ایک دوسرے کے متعلق رکھ سکتے ہیں، یا ایکدوسرے سے کہہ سکتے ہیں، ان حسیات میں جنس کا عنصر نہ تھا، میری طرف سے اسکا خاص التزام رہا، میں کہہ سکتی ہوں کہ تمہارے مقابلہ میں میں اپنے چچا زاد بھائی، یا اپنے دیور سے زیادہ آزادی سے گفتگو کرتی تھی، میں نے اپنے دل سے پوچھا کہ میں تمہارے ساتھ اس قدر احتیاط کیوں برتتی ہوں، مجھے اس کا یقین تھا کہ تمہاری طرف میرے دل کی کوئی کمزوری نہ تھی۔ بھلا میں اس کی روادار ہوسکتی تھی کہ قمر کی آفتاب مسرت کی ضیا پاشی میں کسی ہلکے سے ہلکے بادل کا ٹکڑا بھی حائل ہو؟ میں زندگی کے ہر قدم پر دیکھ رہی تھی۔ کہ دُنیا میں کمیاب مگر محبوب ترین چیز "وفا" ہے، وہ قابلِ رشک زندگیاں، جو ہر وقت ہالۂ مسرت میں نظر آتی تھیں، میں نے دیکھا کہ وہ اس عنصر وفا کے فقدان سے گہنا گئیں، مسرتیں غموں میں تبدیل ہوگئیں، انسانوں کے دماغوں میں داخل ہوکر اگر وہاں کے حالات کا کشف کرنا ممکن ہوتا تو دیکھا جاتا کہ وہاں کردہ و ناکردہ، متصور و متخیل کیا کیا بیوفائیاں، ستم آرائیاں چھپی بیٹھی ہیں، مگر میں دیکھ رہی تھی کہ ایک جاہل بڑھیا کی بے لگام زبان میرے متعلق سرگوشیاں کرانے لگی تھی، اُس نے مجھے اس قدر ڈرپوک کردیا کہ اگر کوئی مجھ سے تمہارے متعلق ذکر کرتا، تو میں یہ خیال کرتی کہ وہ جان کر میری تحقیر کر رہا ہے، اور مجھے یہ گمان ہوتا تھا کہ یہ زہر جو نہ معلوم کہاں سے آرہا ہے میرے شوہر تک میں سرایت کر رہا ہے، اور جب وہ تمہارا ذکر کرتا تو اُس کی نظریں پلٹی ہوئی

معلوم ہوتی تھیں، نوبت یہانتک پہنچی کہ جو زمانہ قمر کے گھر میں گذرتا وہ بھی ان سرگوشیوں کی وجہ سے میرے لئے باعث تکلیف ہوتا میرا وجدان متہم نہ تھا لیکن میں چاہتی تھی کہ ان سرگوشیوں کا خود اُس سے ذکر نہ کروں مجھے اطمینان تھا کہ میری چہیتی بہن میرے گلے میں باہیں ڈال کر مجھ سے کہیگی:-

"میں آپکے اور رشید کے متعلق ان باتوں کا کیسے یقین کر سکتی ہوں"

پچھلی دفعہ میں تین مہینے رہنے کے ارادے سے لکھنؤ گئی تھی، مگر صرف ڈیڑھ مہینہ رہی کیونکہ تمہارے ہاں رہنے سے مجھے خوف آنے لگا ہے، میں اُس خوف سے بھاگتی ہوں۔ جو بلا وجہ میرے سر پر پڑے۔

جس دن ماجد نے مجھ سے ان گمنام خطوں کا ذکر کیا تھا، اُسے دو ہفتے ہو چکے تھے، کہ میں نے رسالے میں تمہاری آخری نظم پر تنقید پڑھی، جو سرتاپا مدحیانہ الفاظ میں تھی، تمہاری نظم کے ہزار ہا نسخے بک رہے ہیں، تمہارے قلم سے وہ نظم نکلی تھی جس نے ایک شاندار مظفریت کے ساتھ تمہیں اقلیم سخن کا تاجدار بنا دیا، مگر مجھے اس نظم کی فوق العادت کامیابی اور اپنی مصیبت میں ایک رابطہ نظر آرہا ہے، اگر تم ایک معمولی آدمی ہوتے تو اس تہمت کو جو اگر واقعیت بھی رکھتی ہوتی، مرورِ زمانہ بھلا دیتا، لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر کسی عورت کا نام کسی بڑے شاعر سے، جھوٹ یا سچ کسی طرح مربوط ہو جائے، وہ ادبیات کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہتا ہے، غرضکہ میں یہ خیال کر کے کانپ اٹھتی تھی کہ باوجودیکہ میں بیگناہ ہوں آیندہ نسلیں مجھے اس ناپاک تہمت کے ساتھ یاد کرینگی، غالباً تمہاری یہ شاندار کامیابی، ناکام شاعروں کے شعلۂ حسد کو بھڑکائیگی، اور وہ تمہاری زندگی کو داغدار بنانے کے لئے ہمیشہ اسکا ذکر کرینگے، اور گھر کی یہ بے بنیاد و بے سروپا باتیں، انکے ہاتھ

لگ کر تمہیں ملوث کرنے کے لئے شوق سے استعمال کی جائینگی۔ بہت ممکن ہے کہ ماجد کے نام جو گمنام خطوط آئے، اُنکے لکھنے والے یہی دنی الطبع حاسد ہوں"

میری بچی سو رہی تھی، میں نے اُسکے ریشمی بالوں پر اپنے ہونٹ رکھ کے حضورِ قلب کے ساتھ خدا کی درگاہ میں دیر تک دعا مانگی کہ وہ یہ اتہام میرے سر سے اُٹھالے، اُس رات، کلب میں ایک دعوت تھی، ماجد اُس میں گیا تھا اور یہ معلوم تھا کہ وہ دیر میں آئیگا، اس لئے میں سونے کے لئے لیٹ چکی تھی اور تھوڑی دیر بعد گہری نیند میں چلی گئی تھی۔

رات آدھی گذری ہوگی۔ مجھے اک کرب سا محسوس ہُوا اور میں جاگی۔ دیکھتی کیا ہوں کہ ماجد، جس کا چہرہ زرد ہے، آنکھیں انگاروں کی طرح سُرخ ہیں ہونٹ غصّہ سے کانپ رہے ہیں، جُھکا ہُوا میرے چہرے کو دیکھ رہا ہے اُس کے مُنہ سے شراب کی بھبک نکل رہی ہے، میں کانپتی ہُوئی اُٹھ بیٹھی ماجد جس نے کبھی شراب نہ پی تھی آج کیوں شراب میں دُھت تھا وہ آج غیر معمولی طور پر خوش خوش گیا تھا، یکایک اُس میں ایسا تغیر کیوں ہوگیا نہایت بُرے اور اکھڑ طریقے سے اُس نے ایک ہنٹر کو جسے وہ ایک ہاتھ میں لئے اور کمر پر رکھے ہوئے چھپائے ہُوئے تھا اب دکھانا شروع کیا اور کہنے لگا "میں لایا تھا بجلی کے لئے (بجلی ایک بازاری عورت کا نام تھا جس کے ساتھ اُس نے بیاہ سے پہلے محبت کی تھی، یہ نام اب اُس نے اپنی چہیتی گھوڑی کو دے رکھا تھا) مگر یہ نصیب میں کسی اور کے تھا"

میرا غرور سمٹ کر جمع ہوگیا، اور میں سیدھی ہو بیٹھی اور میں نے اُس آواز سے جس میں استخفاف اور جرأت دونوں ملی ہُوئی تھیں پوچھا: "مجھے مارو گے؟"

"ہاں"

''کس حق سے؟''

''اس حق سے کہ تم اپنی عصمت کھو بیٹھیں، اور انسانیت کے درجے سے نیچے گر گئیں''

میں نے غصہ سے چلّا کر کہا:- جھوٹا، مفتری''

اس پر یکایک ماجد اک قدم پیچھے ہٹا، اور نرم آواز سے کہنے لگا:-

''کیا تم قسم کھا سکتی ہو کہ رشید سے تمہارا کوئی تعلق نہیں؟''

اس کمینے سوال پر میں اپنے توازنِ طبیعت کو کھو بیٹھی - یہ بے اعتباری اُس شخص کی طرف سے جس کے حق میں مَیں نے تیرہ برس کی طویل مدت میں کوئی چھوٹی سی چھوٹی ایسی حرکت نہیں کی جو بیوفائی کہلائی جا سکے مجھے پاگل کئے دیتی تھی - میں نے جواب دیا:

''میں ہرگز قسم نہ کھاؤں گی، جس عورت کو تم اس قدر رذیل سمجھتے ہو، اُس سے بات ہی کیوں کرتے ہو؟ کہاں ہے تمہاری تلوار اور بندوق؟''

اُس نے کہا:- ''اب بھی غرور!'' اور یہ کہہ کے اور ایک عجیب غرغراہٹ کی آواز گلے سے نکال کے اُس نے میرے سر کے بالوں کو پکڑا اور مجھے کھینچا، میں نے دیکھا کہ اُس نے ہنٹر کو اُٹھایا - میں درد سے تو ڈرتی نہیں، مگر میری عزتِ نفس جسے بچپن سے میں نے بڑے اہتمام سے پالا پوسا تھا اور آسمان تک بلند کیا تھا، اس وقت اس قدر مجروح تھی کہ عین اس لمحہ میں، جب مجھ پر شڑاق شڑاق ہنٹر پڑ رہے تھے اور میری کھال اُدھڑ رہی تھی، میں چاہتی تھی کہ اس مار کی تکلیف زیادہ ہو تا کہ میرے عزتِ نفس کے پامال ہونیکی تکلیف اُس میں دب جائے ۔

ماجد حیران تھا کہ وہ عورت جو معمولی درد سر کی تکلیف میں چیخ اٹھتی تھی کس عناد و تکبر کے ساتھ اس مار کو خاموشی سے سہ رہی تھی، اُس نے اور زور سے مارنا شروع کیا، اُس درد سے جو میرے شانے سے دوڑتا ہُوا میرے قلب تک گیا، آخر کار بیتاب ہو کر میں بیہوش ہو گئی اور نہ معلوم کتنی مُدت تک میں اس حالت میں فرش پر پڑی رہی کہ میرے شانوں سے اور پیٹھ سے خون بہہ رہا تھا، سکوت شب کو روالور کے چلنے کی سخت و قطعی دھماکے نے توڑا، اور میں نے آنکھیں کھولیں، ماجد سپاہی منش ہونے کی اس صفت کے ساتھ جس سے وہ ہمیشہ متصف رہا تھا زمین پر پڑا ہُوا تھا، روالور کی گولی ایک کنپٹی سے دوسری کنپٹی میں نکل گئی تھی،

اس کے بعد کا حال تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا؟ ماجد کے ہاتھ میں ایک گمنام خط پایا گیا، جس میں میرے اور تمہارے تعلقات کی نسبت بہت کچھ زہر اُگلا گیا تھا، یعنی یہ کہ میں جو اچانک لکھنؤ سے بھاگ آئی، وہ اس لئے تھا کہ ماجد کو ہمارے تعلقات کی خبر نہ ہو جائے اس خط نے تہمتوں کو اسی پر بس نہیں کیا، شادی کے آٹھ برس بعد تک میرے کوئی بچّہ نہ ہونا، اور قمر کے بیاہ کے بعد میرے اولاد ہونا . . . . الٰہی توبہ! الٰہی توبہ، میں نہیں لکھ سکتی، یہ ملعون قلم، کیا کسی قاتل کے خنجر سے زیادہ کاٹ کرنے والا نہ تھا؟ ایک ایسے دماغ کے لئے جو مہینوں سے شبہات میں مبتلا تھا، کیا یہ دلائل کافی نہ تھے؟ تھوڑے ہی زمانے میں میری بدنامی پھیلی ہو گی، ہر شخص نے ماجد کے ساتھ ہمدردی کی، اُسکے جنازے پر سارا

شہر آیا، اور ہر شخص نے مجھ پر لعنت کی۔

ماجد زندگی میں جیسا میرے ساتھ رہا سو رہا، مرتے وقت بھی میرے ساتھ برائی کر کے گیا، میرے ساتھ کسی نے وفا نہیں کی، مگر میں نے اپنی ہر حرکت اور ہر بات میں وفا کار و راست باز رہنے کی کوشش کی، اس کا عوض مجھے یہ ملا کہ جس شخص پر میں نے اپنی عمر کے بہترین تیرہ برس قربان کر دئے اُس نے مجھ پر اعتبار نہ کیا اور تا ابد مجھے رسوا کیا، جو آدمی میرا اتنا محرم تھا، جب اُس نے ہی میری بات پر یقین نہ کیا اور اس حد تک یقین نہ کیا کہ اپنے سر میں گولی ماری، تو اب اور کون یقین کریگا، اس خودکشی نے شبہ کو قطعیت، مطلقیت کا درجہ دیدیا، اب کون اسے روک سکتا ہے کہ تاریخ میں میرا نام اس طرح درج ہو کہ یہ وہ ننگِ ناموس عورت تھی جس نے اپنی بہن کے ساتھ بیوفائی کی اگر ماجد یہ کہکر خودکشی کرتا کہ میں اپنے چچا کے بیٹے یا اور کسی کو چاہتی ہوں تو بھی میں عمر بھر کے لئے رسوا اور بدنام ہوتی، مگر اب شاعرِ بے ہمتا، رشید کی سوانح عمری لکھنے والے لکھیں گے کہ اُس کی بیوی کی بہن نے اُس کے ساتھ عشق کیا اور اس بنا پر اُسکے خاوند نے خودکشی کی۔ اسے ایک واقعہ قرار دیکر، بہت کچھ رنگ آمیزیاں کی جائینگی، لوگ تمہیں معذور خیال کرینگے، مگر مجھے مسٹو۔ الٰہی، میں نے کونسا ایسا گناہ کیا ہے جس کے پاداش میں ایسے خوفناک افترا و بہتان پر بھینٹ چڑھائی جا رہی ہوں، مگر ایک بے پروا اور میرا مضحکہ اُڑانے والا مقدر کہتا ہے کہ ہاں تجھ پر ہمیشہ ہمیشہ یہ بہتان تھپے گا، آہ! اب مجھ میں نہ اس کی جرأت

نہ اس کی آرزو کہ میں لکھنؤ آؤں، میں اس سوسائٹی سے جو مجھے اُس گناہ پر جسکی میں مرتکب نہیں ہوں ملعون قرار دیتی ہے، میری زندگی کو برباد کرتی ہے، دُور بھاگنا چاہتی ہوں اپنی زندگی، اپنی بدبخت بچّی کے ساتھ کسی نامعلوم گوشے میں جاکر بسر کرونگی، کسی کو خبر نہ ہوگی کہ میں کہاں چلی گئی، میری بچّی جب جوان ہوگی، اُس وقت میں اُسے سب حال بتاؤنگی، مگر تم سب مجھے پھر نہ دیکھو گے، میں ایک راز ایک معمّا بن کر غائب ہو جاؤں گی اور میرے لئے کسی کی آنکھ سے نہ ایک قطرۂ آنسو کا نکلیگا، اور نہ کسی ہونٹ سے ایک کلمۂ افسوس، عزیز واقربا جان پہچان والے سب ہمیشہ لعنت ہی بھیجیں گے ؛

میں جنہیں پیچھے چھوڑ رہی ہوں، ان میں صرف تم ہی ہو جسے میری بیگناہی کا علم ہے مگر اُس بیگناہی کو ثابت کرنیکا اقتدار نہیں میں اب بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے یہ خط تمہیں کیوں لکھا، مگر تم سے التجا کرتی ہوں کہ اس خط کو قمر کو مت دکھانا، کیونکہ مجھے خوف ہے کہ جس بہتان پر سارا خاندان یقین کر رہا ہے، شاید وہ بھی یقین کرنے لگی ہو، مَیں اُسے معاف کرتی ہوں۔ دیکھو، مجھے اس خیال سے تسلّی ہوتی ہے کہ میری اکلوتی بہن کی زندگی کی خوشی تمہارے ہاتھ میں ہے، میری عزتِ نفس قبول نہیں کرتی کہ تمہارے سوا اَور کسی کو اپنی بے گناہی منوانے کے لئے کچھ لِکھوں، مگر ہاں یہ حسرت ضرور اپنے ساتھ لئے جاتی ہوں کہ اگر میری طرف سے میری بہن کے دل میں غلط خیالات جاگزیں ہو گئے ہیں وہ دُور ہو جاتے ؛

میں تمہیں یہ خط لِکھ رہی ہوں کہ مجھے سمجھنے والے صرف تم ملے ہو،

تم کہ میرا تمہارا کوئی ساتھ نہیں رہا تم نے مجھے اُس آدمی سے زیادہ پہچانا جس کے ساتھ میں نے تیرہ برس گذارے کیا تمہارا ایمان نہیں ہے کہ مجھ سے ایسی حرکت سرزد نہیں ہو سکتی؟ میری سیاہ رُوح میں اب صرف یہی ایک منوّر نقطہ ہے کہ جب ساری دُنیا مجھے ملوث خیال کر رہی تھی تم جانتے تھے کہ میں بیگناہ و پاک ہوں، اک دن میری بیٹی بھی اسے جانے گی۔

تم سے میری اک آخری التجا اور ہے، اسے ایک بیاہی ہُوئی عورت کی آخری آرزو سمجھ کر سنو! تم متاذی و مضطرب ہو کہ اس مُصیبت کے سبب تم ہُوئے جس نے مجھ پر وہ داغ لگایا جو اب دُھل نہیں سکتا اور جو مجھے دائمی جلاوطنی میں بھیج رہی ہے، مگر میری آرزو ہے کہ میرا نام تمہارے لئے اِک عذاب، اک تاسف نہ ہو، بس میں تم سے اس قدر آرزو رکھتی ہوں کہ جب تم میرا نام لو تو یہ خیال کرو کہ میں وہ ہوں جس نے جنسِ نسواں میں تمہیں اور تمہارے کلام کو سب سے بہتر سمجھا۔

یقین مانو کہ زندگی مُصیبتوں میں کاٹنے، پھر بھی زندہ رہنے کی ہمت مجھ میں صرف ایک اسی کی وجہ سے ہے، میری لڑکی!

تاریخ تو مجھے کیا کچھ کہکر یاد کریگی، مگر تم جب میرا خیال کرنا تو یہ خیال کرنا کہ تمہاری اک بہی خواہ ہے جو افتہائے بعید سے تمہاری کوششوں، تمہاری کامیابیوں، تمہاری خوشیوں کو دیکھ رہی ہے، اور تمہارے لئے سعادتِ دین و دُنیا کے حصُول کی دُعا کر رہی ہے، کیا تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا؟

(ملخص) (ہُمایوں)

نمک کا داروغہ

(از منشی پریم چند صاحب بی۔ اے)

جب نمک کا محکمہ قائم ہُوا۔ اور ایک خداداد نعمت سے فایدہ اُٹھانیکی عام ممانعت کردی گئی۔ تو لوگ دروازۂ صدر بند پاکر روزن و شگاف کی فکریں کرنے لگے۔ چاروں طرف خیانت اور غبن اور تحریص کا بازار گرم تھا۔ پٹواری گری کا معزز اور پُر منفعت عہدہ چھوڑ کر لوگ صیغہ نمک کی برقندازی کرتے تھے۔ اور اس محکمے کا داروغہ تو وکیلوں کے لئے بھی رشک کا باعث تھا یہ وہ زمانہ تھا۔ جب انگریزی تعلیم اور عیسائیت مترادف الفاظ تھے۔ فارسی کی تعلیم سند افتخار تھی۔ لوگ حسن اور عشق کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اعلیٰ ترین مدارج زندگی کے قابل ہو جاتے تھے۔ منشی بنسی دھر نے بھی زلیخا کی داستان ختم کی۔ اور مجنوں و فرہاد کے قصۂ غم کو دریافت امریکہ یا جنگِ نیل سے عظیم تر واقعہ خیال کرتے ہُوئے روزگار کی تلاش میں نکلے۔ ان کے باپ ایک جہاندیدہ بزرگ تھے۔ سمجھانے لگے۔ بیٹا! گھر کی حالتِ زار دیکھ رہے ہو۔ قرضے سے گردنیں دبی ہُوئی ہیں۔ لڑکیاں ہیں۔ وہ گنگا جمنا کی طرح بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ میں کگارے کا درخت ہوں۔ نہ معلوم کب گر پڑوں۔ تمہیں گھر کے مالک و مختار ہو۔ مشاہرے اور عہدے کا مطلق خیال نہ کرنا۔ یہ تو پیر کا مزار ہے،

نگاہ چڑھاوے اور چادر پر رکھنی چاہیئے۔ ایسا کام ڈھونڈنا۔ جہاں کچھ بالائی رقم کی آمد ہو۔ ماہوار مشاہرہ پورنماشی کا چاند ہے۔ جو ایک دن دکھائی دیتا ہے، اور پھر گھٹتے گھٹتے غائب ہو جاتا ہے۔ بالائی رقم پانی کا بہتا ہوا سوتا ہے۔ جس سے پیاس ہمیشہ بجھتی رہتی ہے۔ مشاہرہ انسان دیتا ہے اسی لئے اس میں برکت نہیں ہوتی۔ بالائی رقم غیب سے ملتی ہے۔ اسی لئے اس میں برکت ہوتی ہے۔ اور تم خود عالم و فاضل ہو۔ تمہیں کیا سمجھاؤں۔ یہ معاملہ بہت کچھ ضمیر اور قیافے کی پہچان پر منحصر ہے۔ انسان کو دیکھو۔ اس کی ضرورت کو دیکھو۔ موقع دیکھو۔ اور خوب غور سے کام لو۔ غرض مند کے ساتھ ہمیشہ بے رحمی اور بے رخی کر سکتے ہو۔ لیکن بے غرض سے معاملہ کرنا مشکل کام ہے۔ ان باتوں کو گرہ میں باندھ لو۔ یہی ساری زندگی کی کمائی ہیں۔

بزرگانہ نصیحتوں کے بعد کچھ دعائیہ کلمات کی باری آئی۔ منشی دھرنے سعادتمند لڑکے کی طرح یہ باتیں بہت توجہ سے سنیں۔ اور تب گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ اس وسیع دنیا میں جہاں اپنا استقلال اپنا رفیق۔ اپنی ہمت۔ اپنا مددگار اور اپنی کوشش اپنا مربی ہے۔ لیکن اچھے شگون سے چلے تھے۔ خوبی قسمت ساتھ تھی۔ صیغۂ نمک کے داروغہ مقرر ہو گئے۔ مشاہرہ معقول۔ بالائی رقم کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ بوڑھے منشی جی نے خط پایا، تو باغ باغ ہو گئے۔ کلوار کی تسکین و تشفی کی ایک سند ملی۔ پڑوسیوں کو حسد ہوا۔ اور مہاجنوں کی سخت گیریاں مائل بہ نرمی ہو گئیں۔

۲

جاڑے کے دن تھے۔ اور رات کا وقت۔ نمک کے برقندازاور چوکیدار

شراب خانے کے دربان بنے ہوئے تھے۔ منشی بنسی دھر کو ابھی یہاں آئے چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے۔ لیکن اُسی عرصے میں اُنکی فرض شناسی اور دیانت نے افسروں کا اعتبار اور پبلک کی بے اعتباری حاصل کر لی تھی۔ نمک کے دفتر سے ایک میل پورب کی جانب جمنا ندی بہتی تھی۔ اور اس پر کشتیوں کی ایک گزرگاہ بنی ہوئی تھی۔ داروغہ صاحب کمرہ بند کئے میٹھی نیند سوتے تھے۔ یکایک آنکھ کھلی۔ تو ندی کے میٹھے سہانے راگ کی بجائے گاڑیوں کا شور و غل اور ملاحوں کی بلند آوازیں کان میں آئیں۔ اُٹھ بیٹھے۔ اتنی رات گئے گاڑیاں کیوں دریا کے پار جاتی ہیں۔ اگر کچھ دغا نہیں ہے تو اس پردۂ تاریک کی ضرورت کیوں۔ شبہ کو استدلال نے تقویت دی۔ وردی پہنی۔ طپنچہ جیب میں رکھا۔ اور آن کی آن میں گھوڑا بڑھائے ہوئے دریا کے کنارے آ پہنچے۔ دیکھا تو گاڑیوں کی ایک لمبی قطار زلف محبوب سے بھی زیادہ طولانی پُل سے اُتر رہی ہے۔ حاکمانہ انداز سے بولے:۔

"کس کی گاڑیاں ہیں؟"

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا۔ آدمیوں میں کچھ سرگوشیاں ہوئیں۔ تب اگلے گاڑیبان نے جواب دیا۔ "پنڈت الوپی دین کی"۔

"کون پنڈت الوپی دین؟"

"داتا گنج کے"۔

منشی بنسی دھر چونکے۔ الوپی دین اس علاقے کا سب سے بڑا اور ممتاز زمیندار تھا۔ لاکھوں کی ہنڈیاں چلتی تھیں۔ غلے کا کاروبار الگ۔ بڑا صاحب اثر۔ بڑا حکام رس۔ بڑے بڑے انگریز افسر اسکے علاقے میں شکار کھیلنے آتے اور اُسکے مہمان ہوتے۔ بارہ مہینے سدابرت چلتا تھا۔ پوچھا۔ کہاں جائینگی؟

جواب ملا۔ کہ کان پور کو۔ لیکن اس سوال پر کہ "ان میں ہے کیا؟" ایک خاموشی کا عالم طاری ہو گیا۔ اور داروغہ صاحب کا شبہ یقین کے درجے تک پہنچ گیا۔ جواب کے ناکام انتظار کے بعد ذرا زور سے بولے "کیا تم سب گونگے ہو گئے۔ ہم پوچھتے ہیں۔ ان میں کیا لدا ہے"؟

۳

جب اب کے بھی کوئی جواب نہ ملا۔ تو انہوں نے گھوڑے کو ایک گاڑی سے ملا دیا۔ اور ایک بورے کو ٹٹولا۔ شبہ یقین سے ہم آغوش تھا یہ نمک کے ڈھیلے تھے۔

پنڈت الوپی دین اپنے سجیلے رتھ پر سوار کچھ سوتے کچھ جاگتے چلے آتے تھے۔ کہ دفعتاً کئی گھبرائے ہوئے گاڑیبانوں نے آکر جگایا، اور بولے "مہاراج! داروگا نے گاڑیاں روک دیں۔ اور گھاٹ پر کھڑے آپ کو بلاتے ہیں"۔

پنڈت الوپی دین کو مبلغ علیہ السلام کی طاقت کا پورا پورا اور عملی تجربہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے۔ کہ دنیا کا ذکر ہی کیا۔ دولت کا سکہ بہشت میں بھی رائج ہے۔ اور اُن کا یہ قول بہت صحیح تھا۔ قانون اور حق وانصاف یہ سب دولت کے کھلونے ہیں۔ جن سے وہ حسب ضرورت اپنا جی بہلایا کرتی ہے۔ لیٹے لیٹے امیرانہ بے پروائی سے بولے "اچھا چلو ہم آتے ہیں" یہ کہہ کر پنڈت جی نے بہت اطمینان سے پان کے بیڑے لگائے۔ اور تب لحاف اوڑھے ہوئے داروغہ جی کے پاس آکر بے تکلفانہ انداز سے بولے۔ بابوجی اشیرباد۔ ہم سے ایسی کیا خطا ہوئی۔ کہ گاڑیاں روک دی گئیں، ہم برہمنوں پر تو آپ کی نظر عنایت ہی رہنی چاہیئے"۔

بنسی دھر نے الوپی دین کو پہچانا۔ بے اعتنائی سے بولے "سرکاری حکم"۔
الوپی دین نے ہنس کر کہا "ہم سرکاری حکم کو نہیں جانتے۔ اور نہ سرکار کو۔ ہمارے سرکار تو آپ ہی ہیں۔ ہمارا اور آپ کا تو گھر کا معاملہ ہے کبھی آپ سے باہر ہو سکتے ہیں آپ نے ناحق تکلیف کی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ادھر سے جائیں۔ اور اس گھاٹ کے دیوتا کو بھینٹ نہ چڑھائیں۔ میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا"۔

بنسی دھر پر دولت کی ان شیریں زبانیوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ دیانتداری کا تازہ جوش تھا۔ کڑک کر بولے "ہم ان نمکحراموں میں نہیں ہیں جو کوڑیوں پر اپنا ایمان بیچتے پھرتے ہیں۔ آپ اس وقت حراست میں ہیں۔ صبح کو آپکا باقاعدہ چالان ہوگا۔ بس مجھے زیادہ باتوں کی فرصت نہیں ہے جمعدار بدلو سنگھ! تم انہیں حراست میں لے لو۔ میں حکم دیتا ہوں"۔

پنڈت الوپی دین اور اس کے ہوا خواہوں اور گاڑی بانوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ یہ شاید زندگی میں پہلا موقعہ تھا۔ کہ پنڈت جی کو ایسی ناگوار باتوں کے سننے کا اتفاق ہوا ہو۔ بدلو سنگھ آگے بڑھا۔ لیکن فرط رعب سے ہمت نہ پڑی۔ کہ ان کا ہاتھ پکڑ سکے۔ الوپی دین نے بھی فرض کو دولت سے ایسا بے نیاز اور ایسا بے غرض کبھی نہیں پایا تھا۔ سکتے میں آگئے۔ خیال کیا۔ کہ یہ ابھی طفل مکتب ہے۔ دولت کے ناز و انداز سے مانوس نہیں ہوا۔ اکھڑ ہے۔ جھجکتا ہے۔ زیادہ ناز برداری کی ضرورت ہے۔ بہت منکسرانہ انداز سے بولے "بابو صاحب! ایسا ظلم نہ کیجئے۔ ہم مٹ جائینگے۔ عزت خاک میں مل جائیگی۔ آخر آپ کو کیا فایدہ ہوگا۔ بہت ہوا تو تھوڑا سا انعام اکرام مل جائیگا۔ ہم کسی طرح آپ سے باہر

تھوڑا ہی ہیں"۔

بنسی دھر نے سخت لہجے میں کہا "ہم ایسی باتیں سُننا نہیں چاہتے"۔

الوپی دین نے جس سہارے کو چٹان سمجھ رکھا تھا۔ وہ پاؤں کے نیچے سے کھسکتا ہُوا معلوم ہُوا۔ اعتمادِ نفس اور غرور دولت کو سخت صدمہ پہنچا لیکن ابھی تک دولت کی تعدادی قوت کا پورا بھروسہ تھا اپنے مختار سے بولے۔ لالہ جی! ایک ہزار روپیہ کا نوٹ بابو صاحب کی نظر کرو۔ آپ اس وقت بھوکے شیر ہو رہے ہیں۔

بنسی دھر نے گرم ہو کر کہا "ایک ہزار نہیں۔ مجھے ایک لاکھ بھی فرض کے راستے سے نہیں ہٹا سکتا"۔

دولت فرض کی اس خام کارانہ جسارت اور اس زاہدانہ نفس کُشی پر جھنجھلائی اور اب ان دونوں طاقتوں کے درمیان بڑے معرکے کی کشمکش شروع ہُوئی۔ دولت نے پیچ و تاب کھا کھا کر مایوسانہ جوش کے ساتھ کئی حملے کئے ایک سے پانچ ہزار تک۔ پانچ سے دس۔ دس سے پندرہ اور پندرہ سے بیس ہزار تک نوبت پہنچی لیکن فرض مردانہ ہمت کے ساتھ اس سپاہِ عظیم کے مقابلے میں یکّہ و تنہا پہاڑ کی طرح اٹل کھڑا تھا۔

الوپی دین مایوسانہ انداز سے بولے۔ اس سے زیادہ میری ہمّت نہیں آیندہ آپ کو اختیار ہے۔ بنسی دھر نے اپنے جمعدار کو للکارا۔ بدلو سنگھ دل میں داروغہ جی کو گالیاں دیتا ہُوا الوپی دین کی طرف بڑھا۔ پنڈت جی گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گئے۔ اور نہایت منّت آمیز بیکسی کے ساتھ بولے بابو صاحب! ایشور کے لئے مجھ پر رحم کیجئے۔ میں پچیس ہزار پر معاملہ کرنیکو تیار ہوں۔

"غیر ممکن"۔

"تیس ہزار پر"؟

"غیر ممکن"۔

"کیا چالیس ہزار بھی ممکن نہیں"؟

"چالیس ہزار نہیں چالیس لاکھ پر بھی غیر ممکن۔ بدلو سنگھ! اس شخص کو فوراً حراست میں لو۔ اب میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا"۔

فرض نے دولت کو پاؤں تلے کچل ڈالا۔ الوپی دین نے ایک قوی ہیکل جوان کو ہتکڑیاں لئے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔ چاروں طرف مایوسانہ نگاہیں ڈالیں۔ اور تب غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔

۴

دنیا سوتی تھی۔ مگر دنیا کی زبان جاگتی تھی۔ صبح ہوئی۔ تو یہ واقعہ بچے بچے کی زبان پر تھا۔ اور ہر گلی کوچے سے ملامت اور تحقیر کی صدائیں آتی تھیں۔ گویا دنیا میں اب گناہ کا وجود نہیں رہا۔ پانی کو دودھ کے نام سے بیچنے والا گوالا۔ فرضی روزنامچے بھرنے والے حکام سرکار۔ ٹکٹ کے بغیر ریل پر سفر کرنے والے بابو صاحبان اور جعلی دستاویزیں بنانے والے سیٹھ اور ساہوکار یہ سب اس وقت پارساؤں کی طرح گردنیں ہلاتے تھے۔ اور جب دوسرے دن پنڈت الوپی دین کا مواخذہ ہوا۔ اور وہ کانسٹیبلوں کے ساتھ شرم سے گردن جھکائے ہوئے عدالت کی طرف چلے۔ ہاتھوں میں ہتکڑیاں دل میں غصہ و غم۔ تو سارے شہر میں ہلچل سی مچ گئی۔ میلوں میں بھی شاید شوق نظارہ ایسی امنگ پر نہ آتا ہو۔ کثرتِ ہجوم سے سقف و دیوار میں تمیز کرنا مشکل تھا۔

مگر عدالت میں پہنچنے کی دیر تھی۔ پنڈت الوپی دین اس قلزم ناپیدا کنار کے نہنگ تھے۔ حکام ان کے قدر شناس۔ عملے ان کے نیاز مند۔ وکیل اور مختار اُنکے ناز بردار۔ اور اردلی کے چپراسی اور چوکیدار تو انکے درم خریدہ غلام تھے۔ انہیں دیکھتے ہی چاروں طرف سے لوگ دوڑے۔ ہر شخص حیرت سے انگشت بدنداں تھا۔ اس لئے نہیں کہ الوپی دین نے کیوں ایسا فعل کیا۔ بلکہ وہ کیوں قانون کے پنجے میں آئے۔ ایسا شخص جس کے پاس محال کو ممکن کرنے والی دولت اور دیوتاؤں پر جادو ڈالنے والی چرب زبانی ہو۔ کیوں قانون کا شکار بنے۔ حیرت کے بعد ہمدردی کے اظہار ہونے لگے فوراً اس حملے کو رد کرنے کے لئے وکیلوں کا ایک دستہ تیار کیا گیا۔ اور انصاف کے میدان میں فرض اور دولت کی باقاعدہ جنگ شروع ہوئی۔ بنسی دھر خاموش کھڑے تھے۔ یکہ و تنہا۔ سچائی کے سوا اور کچھ پاس نہیں، صاف بیانی کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں۔ استغاثہ کی شہادتیں ضرور تھیں۔ لیکن ترغیبات سے ڈانوا ڈول۔ حتیٰ کہ انصاف بھی کچھ انکی طرف سے کھچا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ ضرور سچ ہے۔ کہ انصاف سیم و زر سے بے نیاز ہے۔ لیکن پردے میں وہ اشتیاق ہے۔ جو ظہور میں ممکن نہیں۔ دعوت اور تحفے کے پردے میں بیٹھ کر دولت زاہد فریب بن جاتی ہے۔ وہ عدالت کا دربار تھا۔ لیکن اس کے ارکان پر دولت کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ مقدمہ بہت جلد فیصل ہوگیا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ نے تجویز لکھی۔ پنڈت الوپی دین کے خلاف شہادت نہایت کمزور اور مہمل ہے۔ وہ ایک صاحب ثروت رئیس ہے یہ غیر ممکن ہے۔ کہ وہ محض چند ہزار کے فایدے کے لئے ایسی کمینہ حرکت کے مرتکب ہو سکتے۔ داروغہ صاحب نمک منشی بنسی دھر پر اگر زیادہ سنگین

نہیں تو ایک افسوسناک غلطی اور خام کارانہ سرگرمی کا الزام ضرور عاید ہوتا ہے۔ ہم خوش ہیں کہ وہ ایک فرض شناس نوجوان ہے۔ لیکن صیغہ نمک کی اعتدال سے بڑھی ہوئی نمک حلالی نے اُسکے امتیاز و ادراک کو مغلوب کر دیا۔ اُسے آیندہ ہوشیار رہنا چاہیئے۔ وکیلوں نے یہ تجویز سُنی اور اچھل پڑے۔ پنڈت الوپی دین مُسکراتے ہوئے باہر نکلے حوالیوں نے روپے برسائے۔ سخاوت اور فراخ حوصلگی کا سیلاب آگیا۔ اور اسکی لہروں نے عدالت کی بنیادیں تک ہلا دیں۔ جب بنسی دھر عدالت سے باہر نکلے۔ نگاہیں غرور سے لبریز۔ توطعن اور تمسخر کے آوازے چاروں طرف سے آنے لگے۔ چپراسیوں اور برقندازوں نے جُھک کر سلام کئے۔ لیکن ایک ایک اشارہ اس وقت اس نشہ غرور پر ہوائے سرد کا کام کر رہا تھا۔ شاید مقدمے میں کامیاب ہو کر وہ شخص اس طرح اکڑتا ہُوا نہ چلتا۔ دنیا نے اسے پہلا سبق دیدیا تھا۔ انصاف۔ علم اور پنچ حرفی خطابات اور لمبی ڈاڑھیاں۔ اور ڈھیلے ڈھالے چغے ایک بھی حقیقی عزت کے مستحق نہیں!

۵

لیکن بنسی دھر نے ثروت اور رسوخ سے بیر مول لیا تھا۔ اس کی قیمت دینی واجب تھی۔ مشکل سے ایک ہفتہ گزرا ہوگا۔ کہ معطلی کا پروانہ آپہنچا۔ فرض شناسی کی سزا ملی۔ بیچارے دل شکستہ اور پریشان حال اپنے وطن کو روانہ ہُوئے۔ بوڑھے منشی جی پہلے ہی سے بدظن ہو رہے تھے۔ کہ چلتے چلتے سمجھایا تھا۔ مگر اس لڑکے نے ایک نہ سُنی۔ ہم تو کلوار اور بوچڑ کے تقاضے سہیں۔ بڑھاپے میں بھگت بن کر بیٹھیں۔ اور وہاں بس وہی سُوکھی تنخواہ

آخر ہم نے بھی نوکری کی ہے۔ اور کوئی عہدہ دار نہیں تھے۔ لیکن جو کام کیا دل کھول کر کیا۔ اور آپ دیانتدار بننے چلے ہیں۔ گھر میں چاہے اندھیرا رہے مسجد میں ضرور چراغ جلائیں گے۔ حیف ایسی سمجھ پر۔ پڑھانا لکھانا سب اکارت گیا۔ اسی اثنا میں بنسی دھر خستہ مکان پر پہنچے۔ اور بوڑھے منشی جی نے روداد سُنی۔ تو سر پیٹ لیا۔ اور بولے۔ جی چاہتا ہے۔ کہ اپنا اور تمہارا سر پھوڑ لوں۔ بہت دیر تک پچتاتے اور کف افسوس ملتے رہے۔ غصّے میں کچھ سخت سُست بھی کہا۔ اور بنسی دھر اگر وہاں سے ٹل نہ جائیں تو عجب نہیں تھا۔ کہ یہ غصّہ عملی صورت اختیار کر لیتا۔ بوڑھی اماں کو بھی صدمہ ہُوا۔ جگن ناتھ اور رامیشور کی آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ اور بیوی نے تو کئی دن تک سیدھے منہ سے بات نہیں کی۔

اس طرح اپنے یگانوں کی ترش روئی اور بیگانوں کی دلدوز ہمدردیاں سہتے سہتے ایک ہفتہ گزر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ بوڑھے منشی رام نام کی مالا پھیر رہے تھے۔ کہ ان کے دروازے پر ایک سجا ہُوا رتھ آکر رُکا۔ سبز اور گلابی پردے۔ پچھائیں نسل کے بیل۔ اُن کی گردنوں میں نیلے دھاگے سینگ پیتل سے منڈھے ہُوئے۔ منشی جی پیشوائی کو دَوڑے۔ دیکھا تو پنڈت الوپی دین ہیں۔ جُھک کر ڈنڈوت کی۔ اور مدبرانہ دُرفشانیاں شروع کیں۔ آپ کو کونسا مُنہ دکھائیں۔ مُنہ میں کالک لگی ہُوئی ہے۔ مگر کیا کریں۔ لڑکا نالائق ہے۔ ناخلف ہے۔ ورنہ آپ سے کیوں مُنہ چھُپاتے۔ ایشور بے چراغ رکھے۔ مگر ایسی اولاد نہ دے۔ بنسی دھر نے الوپی دین کو دیکھا مصافحہ کیا۔ لیکن شانِ خودداری لئے ہوئے۔ فوراً گمان ہُوا۔ کہ یہ حضرت مجھے جلانے آئے ہیں۔ زبان شرمندۂ معذرت نہیں ہُوئی اپنے والد بزرگوار

کا خلوص رواں سخت ناگوار گزرا۔ یکایک پنڈت جی نے قطع کلام کیا "نہیں بھائی صاحب! ایسا نہ فرمائیے"۔

بوڑھے منشی جی کی قیافہ شناسی نے جواب دیدیا۔ انداز حیرت سے بولے "ایسی اولاد کو اور کیا کہوں"۔ الوپی دین نے کسی قدر جوش سے کہا "فخر خاندان اور بزرگوں کا نام روشن کرنے والا۔ ایسا سپوت لڑکا پاکر آپ کو پرماتما کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ دُنیا میں ایسے کتنے انسان ہیں۔ جو دیانت پر اپنا سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہوں۔ داروغہ جی! اسے زمانہ سازی نہ سمجھئے۔ زمانہ سازی کے لئے مجھے یہاں تک تکلیف کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اُس رات کو آپ نے مجھے حکومت کے زور سے حراست میں لیا تھا۔ آج میں خود بخود آپ کی حراست میں آیا ہوں۔ میں نے ہزاروں رئیس اور امیر دیکھے ہزاروں عالی مرتبہ حکام سے سابقہ پڑا۔ لیکن مجھے زیر کیا۔ تو آپ نے میں نے سب کو اپنا اور اپنی دولت کا غلام بنا کر چھوڑ دیا۔ مجھے اجازت ہے کہ آپ سے کوئی سوال کروں؟

منشی دھرکو ان باتوں میں کچھ خلوص کی بُو آئی۔ پنڈت جی کے چہرے کی طرف اُڑتی ہوئی نگر تلاش کی نگاہ سے دیکھا۔ صداقت کی گاڑھی گاڑھی جھلک نظر آئی۔ غرور نے ندامت کو راہ دی۔ شرماتے ہوئے بولے "یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ فرض نے مجھے آپ کی شان میں بے ادبی کرنے پر مجبور کیا۔ ورنہ میں تو آپ کی خاک پا ہوں۔ جو آپ کا ارشاد ہوگا۔ بحد امکان اس کی تعمیل سے انکار نہ کروں گا"۔

الوپی دین نے التجا آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا "دریا کے کنارے آپ نے میرا سوال رد کر دیا تھا۔ لیکن یہ سوال آپ کو قبول کرنا پڑیگا"۔

بنسی دھر نے جواب دیا "میں کس قابل ہوں۔ لیکن مجھ سے جو کچھ ناچیز خدمت ہو سکے گی۔ اُس میں دریغ نہ ہوگا"۔

الوپی دین نے ایک قانونی تحریر نکالی۔ اور اُسے بنسی دھر کے سامنے رکھ کر بولے "اس مختار نامے کو ملاحظہ فرمائیے۔ اور اس پر دستخط کیجئے۔ میں برہمن ہوں۔ جب تک یہ سوال پورا نہ کیجئے گا۔ دروازے سے نہ ٹلوں گا"۔

منشی بنسی دھر نے مختار نامے کو پڑھا۔ تو شکریہ کے آنسو آنکھوں میں بھر آئے۔ پنڈت الوپی دین نے انہیں اپنی ساری ملکیت کا مختار عام قرار دیا تھا۔ چھ ہزار سالانہ تنخواہ جیب خاص کے لئے۔ روزانہ خرچ الگ سواری کے لئے گھوڑے۔ اختیارات غیر محدود۔ کانپتی ہوئی آواز سے بولے "پنڈت جی۔ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ کہ آپ نے مجھے ان عنایاتِ بیکراں کے قابل سمجھا۔ لیکن میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں۔ کہ میں اتنے اعلےٰ رتبے کے قابل نہیں ہوں"۔

الوپی دین ہنس کر بولے "اپنے منہ سے اپنی تعریف نہ کیجئے"۔

بنسی دھر نے متین انداز سے کہا۔ یوں میں آپ کا غلام ہوں۔ آپ جیسے نورانی اوصاف بزرگ کی خدمت کرنا میرے لئے فخر کی بات ہے۔ لیکن مجھ میں نہ علم ہے۔ نہ فراست۔ نہ وہ تجربہ ہے۔ جو ان خامیوں پر پردہ ڈال سکے۔ ایسی معزز خدمات کے لئے ایک بڑے معاملہ فہم کا اور کارکردہ منشی کی ضرورت ہے"۔

الوپی دین نے قلمدان سے قلم نکالا۔ اور بنسی دھر کے ہاتھ میں دیکر بولے "مجھے نہ علم کی ضرورت ہے۔ نہ فراست کی، نہ کارکردگی کی۔ اور نہ

معاملہ فہمی کی۔ اِن سنگ ریزوں کے جوہر میں بارہا پرکھ چکا ہوں۔ اب حُسنِ تقدیر اور حُسنِ اتفاق نے مجھے وہ بے بہا موتی دے دیا ہے۔ جسکی آب کے سامنے علم اور فراست کی چمک کوئی چیز نہیں۔ یہ قلم حاضر ہے۔ زیادہ تامل نہ کیجئے۔ اس پر آہستہ سے دستخط کیجئے میری پرماتما سے یہی التجا ہے۔ کہ آپ کو سدا وہی ندی کے کنارے والا بے مروت۔ سخت زبان۔ تند مزاج لیکن فرض شناس داروغہ بنائے رکھے۔

بنسی دھر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ دل تنگ ظرف میں اتنا احسان نہ سما سکا۔ پنڈت الوپی دین کی طرف ایک بار پھر عقیدت اور پرستش کی نگاہ سے دیکھا۔ اور مختار نامے پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دستخط کر دئے۔ الوپی دین فرطِ مسرت سے اُچھل پڑے۔ اور اُنہیں گلے لگا لیا۔

M.B.P.S.

دِل دینا

(از علامہ محمد عبد الحلیم صاحب شرر لکھنوی)

عُشاق ہر صورتِ زیبا کو دل دیدیتے ہیں۔ شعرا کا دل ہمیشہ کسی کی زلفِ گرہ گیر میں رہا کرتا ہے۔ داستان گو دِل دینے اور دِل لینے کے افسانے بڑے ذوق و شوق سے سُنایا کرتے ہیں۔ ناول نویسوں کا سارا زورِ قلم اس کوشش میں صرف ہُوا کہ کیسے کوئی دل دیتا اور کوئی لیتا ہے؟ خلاصہ یہ کہ دل دینا ایک نہایت ہی آسان مشغلہ سمجھ لیا گیا اور ہمارے عاشق مزاج نوجوان دِل ہاتھوں میں لئے پھرنے لگے کہ کوئی اچھی صورت دیکھیں اور حوالے کر دیں۔

مگر افسوس صحیح طور پر نہ آجتک کسی نے دل دیا۔ نہ کسی نے لیا اور نہ کوئی سمجھا کہ دل دینا کیا چیز ہے اور کیسے دِل دیتے ہیں۔ صدہا عاشقوں اور معشوقوں کی داستانیں، دلدہی و دلبری کے دلچسپ نمونے سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن غور کرو تو نہ کسی نے دل دیا نہ کسی نے لیا۔ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ سچے اور صحیح معنوں میں دل دینے کا کہیں پتہ نہیں۔

لیکن ہاں یورپ کا ایک واقعہ جو قرونِ وسطیٰ میں پیش آیا تھا وہ البتہ دِل دینے اور لینے کا سچّا معاملہ ہے چونکہ ہمارے عاشقوں اور شاعروں کے کان اس سے نا آشنا ہیں۔ اس لئے ہم اس

واقعے کو اُنکے سامنے پیش کئے دیتے ہیں کہ لوگ دیکھیں۔ اور سمجھیں کہ دل دینا کیا چیز ہے؟

جن دِنوں صلیبی لڑائیوں کے معرکے درپیش تھے اور بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھیننے کے لئے سارا یورپ اُمڈا چلا آتا تھا۔ فرانس میں نواب شانپین کے دربار میں ایک بڑا معزز سردار تھا۔ لارڈ کوسی جو خوبصورت اور قابل ہونے کے ساتھ اپنے وقت کا بڑا بانکا بھی تصور کیا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں وہاں ایک اور بڑے معزز رئیس تھے لارڈ فائل۔ لارڈ فائل کی نازنین زہرہ جبین بیوی لیڈی فائل اپنے حسن و جمال اور ناز و انداز کے لحاظ سے سارے ملک میں منتخب تھی۔ اور فرانس کی ساری مہ جبینوں کے حسن کی شمعیں لیڈی فائل کے آفتاب رخسار کے سامنے ماند تھیں۔ دونوں کی خوبیوں نے یہ شرمناک کرشمہ دکھایا کہ لارڈ کوسی اور لیڈی فائل ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے۔ اور ناجائز اُلفت نے دونوں کے دلوں میں عشق کی شمعیں روشن کر دیں لارڈ فائل بیوی کے اس شرمناک عشق سے ناواقف نہ تھا۔ ہر طرح کی روک تھام کرتا مگر کچھ زور نہ چلتا۔

اِسی اثنا میں نواب شانپین تیار ہُوا کہ ارض مقدس میں جاکر مسلمانوں کے مقابلے میں جہاد کرے جو مجاہدین فرانس اُس کے ہمراہ روانہ ہونے والے تھے اُن کے زمرے میں لارڈ کوسی نے بھی اپنا نام لکھوا دیا۔ اپنے اِس ارادے کی خبر جب اُس نے لیڈی فائل کو کی تو معشوقۂ دلنواز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ روئی اور رلایا۔ مگر آخر ضبط سے کام لیا۔ دِل میں کہا اچھا ہے۔ لارڈ کوسی کے چند روز باہر رہنے سے

لارڈ فائل کی آتشِ رقابت ٹھنڈی پڑ جائیگی اور شاید اُن کی بدگمانیاں دُور ہو جائیں"

اس کے بعد ہنسی خوشی عاشقِ دلدادہ کو گلے لگا کے رخصت کیا، اور کہا لو یہ ہماری الفت و محبت کی یادگاریں ساتھ لیتے جاؤ۔ اور ان کو ہمیشہ اپنے دل سے لگائے رکھنا۔ یہ یادگاریں چند انگوٹھیاں تھیں کچھ جواہرات تھے۔ اور سب سے زیادہ قیمتی ایک نازک ڈوری تھی جسکو لیڈی فائل نے اپنی سنہری زلفوں کے بالوں کو ریشم کے دھاگے میں گوندھ کے بنایا تھا۔ اور اُس کے دونوں سروں پر دو بڑے بڑے موتی گھنڈیوں کی وضع میں لگے ہوئے تھے۔ ان دنوں یورپ کے بانکوں اور فرنگی سرداروں کی وضع تھی کہ اپنے فرغل کو ایک خوبصورت ڈوری سے خود میں اٹکا لیا کرتے۔ اور اسی مقصد کے لئے لیڈی فائل نے یہ ڈوری خود اپنے ہاتھ سے بنا کے اپنے عاشق کو دی۔ الغرض بصد حسرت و اندوہ عاشق و معشوق جُدا ہوئے۔ اور لارڈ کوسی نے شانپین کے نواب کے ہمراہ ارضِ مقدس فلسطین کی راہ لی۔

یہ ۵۸۸ھ کا زمانہ تھا۔ جبکہ فلسطین کے مشہور ساحلی شہر عکہ کا مشہور محاصرہ قائم تھا۔ شہر کے اندر مسلمان تھے۔ لاکھوں فرنگیوں کی خلقتِ عظیم چاروں طرف سے یورشیں کر رہی تھی۔ اور ان محاصرہ کرنے والوں کو سلطان صلاح الدین اعظم خشکی کی طرف سے گھیرے ہوئے تھے خونریزیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ اور مسیحی کسی طرح شہر پر قابو نہ پا سکتے تھے۔

نواب کوسی نے نئے مجاہدینِ فرنگ کے ساتھ ساحلِ فلسطین پہ قدم رکھا تو وہ بھی زور و شور سے دھاوے کرنے لگا۔ اور ایک دن

ایسے جوش و خروش سے دھاوا کیا کہ تیروں پتھروں اور آتشباری کے قمقموں کو ڈھال پر لیتا ہوا عکہ کی شہر پناہ کے نیچے جا پہنچا۔ اور سیڑھی لگا کے اوپر چڑھنے لگا فصیل کے اوپر سر نکالا ہی تھا کہ کسی مسلمان نے تلوار کا ایسا زبردست ہاتھ مارا کہ کاری زخم کھا کے نیچے آرہا۔ اور لوگ فوراً خیمے میں اُٹھا لے گئے۔

خیمے میں لیٹ کر لارڈ کُوسی نے خیال کیا کہ اب میری زندگی کے چند ہی لمحے باقی ہیں۔ ساتھ ہی محبوبہ جاں نواز یاد آئی اور ارادہ کیا کہ زندگی کے ان باقیماندہ لمحوں کو اسی کی یاد میں صرف کرے۔ چنانچہ لیڈی فائل کے نام ایک عاشقانہ خط لکھا۔ اور اپنے ایک قدیم وفادار و جاں نثار ملازم کو دے کر کہا میرے مرنے کے بعد تم فرانس میں جانا اور اس خط کو میری دلدار مہجبیں کے ہاتھ میں دیدینا۔ اس کے ساتھ یہ تمام چیزیں بھی جو اُس نے مجھے یادگار محبت کے طریقے سے دی تھیں اُسے واپس کر دینا۔ اس کے علاوہ جب میں مر چکوں تو سینہ چاک کر کے میرا دل نکال لینا اور اس کو تیل میں ڈالدینا کہ سڑنے نہ پائے اور اس کو بھی لیجا کر اسی آفت جاں کی نذر کر دینا۔"

یہ وصیتیں کر کے لارڈ کُوسی مر گیا۔ اور وفادار ملازم نے ان پر پُورا عمل کیا۔ سفر کر کے فرانس میں پہنچا۔ اور لارڈ فائل کے قصر کے قریب جا کر پھاٹک کے سامنے جنگل میں چھُپ رہا کہ لارڈ فائل کہیں باہر جائے تو قلعہ میں داخل ہو کر اپنے آنجہانی آقا کی امانتیں اُس کی محبوبہ کے حوالے کرے۔ اسی انتظار میں کھڑا تھا کہ لارڈ فائل کی نظر پڑ گئی۔ دیکھتے ہی پہچان گیا کہ لارڈ کوسی کا ملازم ہے اور اپنے آقا کا کوئی پیام لیکر میری بیوی

کے پاس آیا ہے غیظ و غضب کے ساتھ اُسکے سر پر جا پہنچا اور کہا "سچ سچ بتا یہاں کس لئے آیا ہے ورنہ تیری جان کی خیر نہیں" ملازم نے قسمیں کھا کر کہا "میرے مالک تو ارضِ مقدس میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے اب پیام دینے والا کون ہے"؟ لارڈ فائل کو اس کا یقین نہ آیا سمجھا کہ فضول باتیں بنا رہا ہے۔ تلوار میان سے کھینچ کر اُسکے سر پر بلند کی اور ڈپٹ کے کہا "بتا ورنہ سر زمین پر پڑا لوٹتا ہوگا" خادم سہم گیا۔ ہوش و حواس جاتے رہے۔ اور جان کے خوف سے ساری باتیں قبول دیں جو چیزیں ساتھ لایا تھا اُس کے سامنے رکھ دیں۔ اور لارڈ کوسی کا خط بھی اُسکے ہاتھ میں دیدیا خط پڑھ کر لارڈ فائل کے غصّے کی انتہا نہ تھی۔ اور جوشِ غضب میں ارادہ کیا کہ بیوی سے ایک نئے طریقے کا انتقام لے۔ فوراً قصر میں آکر اپنے باورچی کو بُلایا۔ اور وہ لارڈ کوسی کا دل اُس کے ہاتھ میں دیکر کہا "اس کو اور گوشت میں ملا کر بہت اچھے نفیس کباب پکاؤ" کباب لیڈی فائل کی نہایت ہی مرغوب غذا تھی۔ جیسے ہی پک کر آئے لارڈ فائل نے میز پر بیٹھ کر اُن کو بیوی کے سامنے پیش کیا اور کہا "تمہارے شوق کے مطابق انکو بڑے اہتمام سے پکوایا ہے" بیوی نے اُن کبابوں کو بڑے شوق سے لیا۔ مزہ لے لے کر کھایا۔ اور جب کھا چکی تو میاں نے ایک زہر خند کے ساتھ پوچھا "کیسے پکے ہیں"؟ جواب ملا کہ "بہت اچھے پکے ہیں۔ اور مجھے بہت مزہ آیا" کہا "ہاں یہ مزہ آنے کی چیز ہی تھی۔ تمہارے مرغوب ہونے ہی کے خیال سے میں نے اس کو بڑی کوشش سے تیار کرایا۔ اور تمہیں پسند کیوں نہ آتا؟ یہ خاص لارڈ کوسی کا دل تھا جس کی قدر تم سے زیادہ کون کریگا"؟ لیڈی فائل کو اس کا یقین نہ آیا مگر جب میاں نے ساری

سرگزشت من وعن بیان کردی۔ اور بیوی کے دئے ہوئے یادگارِ محبت تحفوں کے ساتھ لارڈ کوسی کا خط بھی نکال کے سامنے رکھ دیا تو کانپ گئی۔ اور یقین آیا کہ شوہر نے جو کچھ کہا سچ ہے۔

اُس کے خون شدہ دُکھے دل پر یاس و نامرادی کا ہجوم ہُوا۔ مگر ضبط کیا۔ اور استقلال کے تیوروں سے بولی "ہاں سچ کہتے ہو۔ یہ دل میرا محبوب تھا۔ کیونکہ یہ محبت کرنے کے قابل دل تھا اور کبھی اس سے زیادہ شریف دل نہیں دیکھا گیا تھا۔ اور میں نے چونکہ ایسا اچھا اور شریف گوشت کھایا ہے اور میرا معدہ ایک ایسے بہترین اور قیمتی دل کا مقبرہ بن گیا ہے لہذا اب میں کوئی اس سے کم درجے کی چیز نہ کھاؤں گی نہ اس اچھے دل کو کسی ذلیل چیز سے آلودہ کرکے ناپاک کرونگی" یہ کہتے کہتے پُرحسرت زبان رُک گئی۔ اُٹھ کر اپنے کمرے میں گئی اور اندر سے دروازہ بند کرکے بیٹھ رہی۔ دوستوں۔ عزیزوں۔ ملازموں اور خود شوہر نے لاکھ کہا اور قسمیں دلائیں مگر دروازہ نہ کھولا۔ یہاں تک کہ اسی رنج میں فاقے کرتے کرتے چوتھے روز ملکِ عدم کی راہ لی۔

(ہمایوں)

سدا بہار ٹاپو کا ہندی

(از ابو رشید مولینا عبد المجید صاحب سالک بی۔ اے)

آج سے سیکڑوں برس پیشتر کا واقعہ ہے۔ بحیرۂ عرب میں زبردست طوفان اُٹھتے۔ بادو باراں کی چیرہ دستیاں اور سمندر کی آسماں بوس موجیں بحری سوداگروں کے لئے پیام اجل لاتیں۔ جتنے دن جہاز بحر متلاطم کے سینے پر رہتا۔ اہلِ جہاز کی آنکھیں اُمید و بیم کی حالت میں آسمان پر لگی رہتیں ؛

اسی زمانے میں ایک بادبانی جہاز سوداگروں کے لئے ہندوستان سے افریقہ کو روانہ ہُوا۔ پہلے چند روز تک تو آسمان صاف ہوا موافق موسم خوشگوار رہا۔ لیکن کوئی ایک عشرے کے بعد ایک تاریک رات میں عناصر کی کشمکش نے قیامت برپا کر دی۔ ہوا کہتی تھی۔ پانی نے سطح ارضی کا تین چوتھائی حصّہ دبا رکھا ہے۔ میں اس سے چھین کر رہونگی پانی کہتا تھا۔ کسی طرح بھی ہو۔ فضا کو اس عنصر سرکش سے پاک کر کے آسمان تک اپنے جوشِ تلاطم و خروش، امواج کے جھنڈے گاڑدوں ؛

اِن دونوں مظاہرِ قدرت الٰہی کی چپقلش رنگ لائی۔ پانی کے ایک پُرزور تھپیڑے نے جہاز کے ٹکڑے اُڑا دئے۔ بادبان پارہ پارہ ہو گئے اہلِ جہاز نہنگِ امواج کا شکار بنے۔ عین اس ہنگامۂ رستخیز کے عالم میں جہاز کا نوجوان مالک ارشاد ایک ٹوٹے ہُوئے تختے پر اپنا چرمی صندوق

سنبھالے سمندر کی سطح پر تنکے کی طرح تیر رہا تھا۔ طوفانی سمندر کے تھپیڑوں نے اسے معلوم نہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ تختہ رات بھر خدا جانے کس طرف بہتا رہا۔ ارشاد کے پاس قبلہ نما نہ تھا۔ کہ سمت معلوم کرتا۔ اس نے تختے پر چت لیٹ کر اپنے آپ کو بے پایاں سمندر کی موجوں کے حوالے کر دیا۔

صبح ہوئی تو آسمان بالکل صاف تھا۔ سطح بحر اور کرۂ ہوائی دونوں ساکن تھے ارشاد کیا دیکھتا ہے۔ کہ دور اُفق میں ایک نقطہ سا نظر آ رہا ہے۔ اور سمندر کی رَو تختے کو اسی طرف لے جا رہی ہے۔ اس کے دل میں بہت سے خیالات آئے کبھی وہ سمجھتا۔ کہ افریقہ کا ساحل ہے۔ کبھی سوچتا ممکن ہے ہندوستان ہی کا کنارہ ہو۔ کبھی یہ گمان گزرتا۔ خدا جانے کوئی وحشیوں کا جزیرہ ہے۔ اس آخری خیال سے وہ کانپ اُٹھا مگر چرمی صندوق کی طرف دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔ صندوق میں روزمرہ کی اشیائے ضروری کے علاوہ اس کی قیمتی بندوق اور کافی مقدار میں گولی بارود موجود تھی۔

کوئی تین گھنٹے تک تختہ سمندر کی رَو کے ساتھ بہتا رہا۔ آخر ایک چھوٹے سے جزیرے کے کنارے جا لگا۔ منطقۂ حارہ کے خوش نوا پرندوں کے چہچہوں۔ آب و ہوائے گرم میں کھلنے والے پھولوں کی تیز اور مست خوشبو اور موسم بہار کی شادابیوں نے ارشاد کا استقبال کیا۔ وہ اپنے تختے سے اُترا۔ چرمی صندوق اُٹھایا۔ اور ساحل کی دلدلی زمین اور سرکنڈوں کے جھنڈ میں سے بصد دقت خشکی پر پہنچا۔

۲

ارشاد نے اس جزیرے کا نام لالہ زار رکھا۔ جزیرہ والوں نے اس سے کچھ تعرض نہ کیا۔ بلکہ ملنے جلنے میں اس کا خوشگوار تبسم اور شکار میں اس کی بندوق کی حیرت انگیز کارفرمائیاں دیکھ کر وہ اس سے بہت کچھ مانوس ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ناخواندہ مہمان کے رہنے کے لئے سرکنڈوں کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی ساحل کے قریب بنادی اس میں ارشاد رہتا۔ ہر روز شکار کرتا۔ چقماق جھاڑ کر آگ جلاتا۔ اور شکار بھون بھان کے کھالیتا۔ اہلِ جزیرہ اپنی زبان میں اسے پیارا کہتے تھے۔

ارشاد کو لالہ زار میں رہتے کافی عرصہ گزر گیا۔ اور اس عرصے میں اس نے اہلِ جزیرہ کی زبان میں بھی کچھ کچھ مہارت پیدا کر لی۔ اس سے پہلے ارشاد وحشیوں سے اور وحشی ارشاد سے زبانِ اشارات میں تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ لیکن اب باتیں ہونے لگیں۔ معلوم ہوا۔ کہ اس جزیرے کے آس پاس قریب ہی دو ایک جزیرے بھی واقع ہیں۔ اور ان جزیروں کے تعلقات آپس میں نہایت دوستانہ ہیں۔ وحشیوں نے چھوٹی چھوٹی عجیب سی بادبانی کشتیاں بھی بنا رکھی ہیں۔ جن میں سوار ہو کر وہ ایک دوسرے کے جزیرے میں جاتے ہیں۔

اہلِ جزیرے میں سے ایک نوجوان لڑکی زہرہ جس کا گندمی رنگ۔ موزوں قد۔ کالے بھونرا سے گھنے اور لمبے بال اور پورا ابھرا ہوا سینہ غرض حسن و جوانی کے تمام سامان مستی شباب کا اعلان کر رہے تھے۔ اور جس کی بڑی بڑی سیاہ اور رسیلی آنکھوں سے شرابِ حسن چھلکی پڑتی

تھی۔ اکثر ارشاد کو دیکھا کرتی۔ وہ روز صبح کے وقت ارشاد کی جھونپڑی کے سامنے سے گزرتی۔ اور ہنس کر ارشاد سے اپنی زبان میں کہتی "پیارے سلام قبول کرو"

ایک دن صبح کے وقت بہت گرمی تھی۔ زہرہ ابھی جھونپڑی کے سامنے سے نہیں گزری تھی۔ لیکن وقت مقررہ گزر چکا تھا۔ ارشاد کو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی عادی شراب خوار کو وقت پر شراب نہ ملے۔ اعضا شکنی سی ہو رہی تھی۔ جمائیوں پہ جمائیاں آ رہی تھیں۔ اس نے اپنے کرتے کے بوتام کھول ڈالے۔ جوتا اتار دیا۔ اور گھاس پر چت لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ وہ دل ہی دل میں کہنے لگا "یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ زہرہ نہ آئی۔ تو کونسا غضب آ گیا۔ وہ ہر روز اس وقت گزرا کرتی تھی۔ آج کیوں نہ آئی۔ لاحول ولا قوۃ۔ مجھے اس سے کیا تعلق۔ میں مہذب دنیا کا رہنے والا معزز سوداگر۔ بادشاہوں کے دربار میں باریاب۔ وہ ایک وحشی جزیرے کی لڑکی۔ میرا اس کا کیا میل لیکن ——— میرا دل اس کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ آہ! وہ آنکھیں وہ بال۔ وہ جوانی اُف" ارشاد نے کیف تصور سے مخمور ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

ارشاد کسی کے پاؤں کی آہٹ سُن کر اُٹھا۔ سامنے زہرہ اپنے سادہ و بے تکلف حسن کے نشے میں چُور ہاتھ میں ایک برتن لئے مسکرا رہی تھی۔ ارشاد کو اُٹھتے دیکھ کر وہ آگے بڑھی۔ اور اپنے مخصوص اندازِ رعنائی سے کہا "پیارے۔ سلام قبول کرو۔ بیمار تو نہیں ہو؟"

ارشاد نے آنکھیں نیچی کریں۔ اور کہا "نہیں بیمار تو نہیں ہوں۔ مگر

زہرہ تم یہاں کیسے آئیں"؟

"پیارے۔ میں تمہارے لئے یہ حلوا لائی ہوں۔ تمہیں ضرور بھوک لگی ہوگی مرد اچھا کھانا نہیں پکا سکتے۔ دیکھو میں نے یہ حلوا تمہارے لئے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے"۔

ارشاد نے نظریں اٹھا کر زہرہ کے چہرے کو دیکھا لیکن خاموش ر

زہرہ۔ پیارے۔ تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟

یہ فقرہ زہرہ نے کچھ ایسے خالص انداز نسوانی میں ادا کیا۔ ک ارشاد کا دل پس گیا۔ زہرہ نے حلوے کا برتن ارشاد کے آگے رکھ دیا۔ ارشاد بھوکا تھا۔ آج سے نہیں۔ مہینوں سے۔ اسے کھانا پکانا نہیں آتا تھا۔ پرندے شکار کرکے لاتا۔ اور نیم بریاں کر کے کھا جاتا۔ یہ قوت لایموت تھی۔ اس میں غذائی لذت کا نام ونشان نہ تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے حلوے کا برتن اٹھایا اور کہا:۔

ارشاد۔ میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں۔ لیکن ایک کام کر دو میری جھونپڑی کے اندر جاؤ۔ طاقچہ میں ایک سیپی پڑی ہے۔ وہ اٹھا لا میں اس سے کھاؤں گا۔ مجھے انگلیوں سے کھانے کی عادت نہیں

زہرہ بھاگی بھاگی جھونپڑی کے اندر گئی۔ اور سیپی لاکر کچھ اس انداز سے ارشاد کو دی۔ جیسے کوئی کسی بچے سے مذاق کرے، ارشا نے حلوہ بہت رغبت سے کھایا۔ برتن خالی کر کے رکھ دیا۔ اور زہرہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھنے لگا۔

ارشاد۔ زہرہ! تم یہ تو بتاؤ۔ تم میرے لئے یہ حلوا کیوں لائی تھیں تم روز میرے مکان کے سامنے سے گزرتے وقت مجھ سے کیوں کہت

ہو۔ پیارے سلام قبول کرو۔ تم اس وقت مجھے دیکھ کر کیوں مسکرا رہی ہو؟
زہرہ۔ (نہایت معصومانہ انداز سے) پیارے جب سے تم یہاں آئے ہو۔ میرے دل کی روشنی ہو۔ تمہارے آنے سے پہلے دنیا تاریک تھی اگر تم یہاں سے چلے گئے تو پھر تاریک ہو جائیگی ۔

یہ کہکر زہرہ نے گھٹنے ٹیک کر ہاتھ باندھے اور کہا "پیارے مجھے اجازت دیدو۔ کہ میں تمہارے لئے روز اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر لایا کروں۔ میری سب سے بڑی حسرت یہی ہے۔ کہو منظور ہے؟"
ارشاد۔ بہت اچھا۔ زہرہ۔ مجھے منظور ہے ۔

زہرہ اس منظوری کی خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ وہ آگے بڑھی خالی برتن اٹھایا۔ اور خوشی سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی چلدی ارشاد بدستور گھاس پر لیٹ گیا۔ اور آنکھیں بند کرلیں۔ کہ اردگرد کا منظر یکسوئی خیال میں دخل انداز نہ ہو ۔

لیکن زہرہ اسی وقت بھاگتی ہوئی واپس آئی۔ دم چڑھا ہوا تھا ارشاد کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔ اور کہنے لگی :۔

"پیارے ا ــــ اٹھو ــــ جلدی کرو۔ جوتا پہن لو۔ اور اپنی بندوق اٹھاؤ۔ سدا بہار ٹاپو کا ہندی آگیا"

ارشاد ہنس پڑا۔ اور بولا "سدا بہار ٹاپو کا ہندی یہ کسی جنگلی جانور کا نام ہے؟ آخر جب ارشاد نے دیکھا۔ کہ زہرہ بیحد خوف زدہ ہے تو وہ ہنسی ضبط کرکے اٹھا۔ جوتا پہنا۔ بندوق بھر کر اٹھالی اور زہرہ کے ساتھ چل دیا۔ کوئی پندرہ بیس قدم گیا ہوگا۔ کہ اسے کنارے کے نزدیک ایک کشتی آتی دکھائی دی۔ زہرہ نے اس کی طرف

اشارہ کر کے کہا "پیارے دیکھنا بندوق تیار رکھنا۔ یہ سدا بہار ٹاپو کا ہندی بہت خوفناک آدمی ہے۔ مجھے تو اس سے بہت ڈر لگتا ہے"۔

ارشاد اُس آنے والے کا اتنا لمبا اور عجیب نام سُن کر پھر مُسکرایا آخر جب وہ شخص کشتی سے اُترا۔ تو ارشاد نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا لمبا سا آدمی ہے۔ چہرے اور جسم کا رنگ سانولا ہے۔ سر اور ڈاڑھی کے بال بے انتہا بڑھے ہُوئے اور اُلجھے ہُوئے ہیں۔ سوائے ایک پاجامے کے اس کے بدن پر اور کوئی کپڑا نہیں۔ اور وہ پاجامہ بھی گھٹنوں تک اوپر چڑھا رکھا ہے۔ ایک ہاتھ میں کوئی دس بیس ناریل گٹھڑی میں بندھے ہیں۔ اور دوسرے ہاتھ سے ایک پانچ چھ سال کے بچے کا ہاتھ تھام رکھا ہے۔ بچے کا رنگ اُس شخص کے رنگ سے کھُلا ہُوا اور صاف ہے۔

نووارد شخص نے کنارے پر اُترتے ہی ارشاد کو دیکھا۔ حیران ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ اور پاس آکر ہندوستانی زبان میں بولا "صاحب سلام عرض کرتا ہوں"۔

یہ کہکر اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ارشاد نے تین چار مہینے کے بعد اپنی زبان کے چند الفاظ دوسرے شخص سے سُنے اور ایسے مقام پر سُنے۔ جہاں اس بات کا گمان بھی نہ ہو سکتا تھا، اسے سخت تعجب ہُوا۔ اس نے نہایت خندہ پیشانی سے سلام کا جواب دیا۔ اور پوچھا "آپ کا نام"؟ اس شخص نے کہا "صاحب مجھے اسمٰعیل کہتے ہیں۔ (یا کہتے تھے) میں نے کوئی دس سال کے بعد آج اپنے ہموطن کی صورت دیکھی ہے۔ براہِ کرم مجھے اپنا نام بتائیے۔ ارشاد نے اپنا نام بتایا۔

اسمٰعیل بہت شوق و اشتیاق کی نظروں سے ارشاد کو دیکھ رہا تھا۔ اسکے بعد اس نے زہرہ کے بشاش و مغرور چہرہ پر نظر ڈالی۔ زہرہ نے اپنی مخصوص سادگی کے ساتھ ارشاد کو محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ اسمٰعیل سارا معاملہ سمجھ گیا۔ اور خاموش سر ہلانے لگا۔ اسکے بعد اس نے ارشاد سے کہا۔ بھائی ارشاد مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ ارشاد نے کہا۔ غریب خانے میں چلے چلئے۔ وہاں بیٹھ کر باتیں کرینگے"۔

اسمٰعیل۔ اس کے ساتھ کا لڑکا۔ ارشاد اور زہرہ چاروں گھاس پر بیٹھ گئے۔ زہرہ۔ اسمٰعیل و ارشاد دونوں کی عجیب بولی سُن کر متعجب ہو رہی تھی۔ کبھی حیران ہو کر اسمٰعیل کے چہرے کو دیکھتی۔ کبھی ارشاد کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتی۔ اسمٰعیل نے کہا" بھائی ارشاد میں ہندوستانی میں بات چیت کروں گا۔ تاکہ یہ لڑکی نہ سمجھے میری باتیں توجہ سے سُننا۔ ممکن ہے میری گفتگو تمہارے لئے بے انتہا مفید ثابت ہو"۔

"دس سال گزر گئے۔ ایک زمانہ تھا۔ کہ میں بھی تمہاری طرح خوبصورت نوجوان تھا۔ ہم ہندوستان سے جہاز پر سوار ہو کر افریقہ جا رہے تھے راستے میں جہاز غرق ہو گیا۔ میں ایک تختے پر تیرتا ہُوا اس جزیرے میں پہنچا۔ میں دیکھتا ہوں۔ کہ تمہارے پاس تو بندوق وغیرہ بھی ہے لیکن میرے پاس کچھ نہ تھا۔ میں نے چند روز یہاں کے رہنے والوں کی مہمان نوازی پر گزران کی۔ کچھ عرصہ بناس پتی اور پھل پھلاری کھا کر کاٹا۔ تنہائی کی مصیبت میرے لئے ایسی ہی ناقابلِ برداشت تھی۔ جیسے اس وقت تمہارے لئے ہے۔ بعض دفعہ مجھے شک ہوتا تھا۔ کہ میں اپنی مادری زبان نہیں بھول سکتا۔ انسان رات کی تاریکی اور جنگل کی خاموشی و تنہائی میں

اپنے آپ سے اسی زبان میں باتیں کیا کرتا ہے۔ خدا کی یاد ہمیشہ اسی زبان میں کرتا ہے دعائیں اسی زبان میں مانگتا ہے۔ مادری زبان قابل فراموش نہیں!

"کوئی دو مہینے گزرے ہونگے۔ ایک دن ایک نوجوان پندرہ سولہ سال کی لڑکی مشتری میرے پاس آئی۔ اور میرے لئے۔ شکر۔ ناریل اور دودھ کا حلوا بنا کر لائی وہ حلوا میں نے کس رغبت سے کھایا تم سے بیان کرنیکی حاجت نہیں۔ بھائی ارشاد۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ سامنے گھاس پر ایک مٹی کا برتن پڑا ہے۔ جس میں غالباً تم نے اسی قسم کا حلوا کھایا ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ اس میں پیپی بھی رکھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ ابھی تم نے انگلیاں چاٹنی شروع نہیں کیں۔ لہذا تمہارے بچاؤ کی امید باقی ہے۔

"آہ۔ وہ میری حیاتِ عشق کا پہلا دن تھا۔ جس دن مشتری نے مجھ سے نہایت معصومانہ انداز کے ساتھ کہہ دیا۔ کہ وہ مجھ سے محبت ہی نہیں بلکہ میری پرستش کرتی ہے وہ میرے لئے کھانا پکاتی اور وحشیوں کے گیت گا گا کر مجھے سناتی۔ میں ایک دفعہ بیمار ہوا۔ تو اس نے راتیں میرے سرہانے بیٹھ کر کاٹ دیں۔ نتیجہ کیا ہوا؟ وہی جو ہونا چاہیئے تھا مشتری کی محبت نے مجھے مسحور کر دیا۔ اس کی ایک لحظے کی جدائی میرے لئے قیامت تھی۔ آخر میں نے اس سے شادی کر لی۔

"یہاں کے وحشیوں نے شور مچایا۔ مشتری نے انہیں سمجھا بجھا کے خاموش کیا۔ اور کہہ دیا۔ کہ اسمٰعیل میرے دل و جان کا مالک ہے تم مجھے دنیا سے جدا کر سکتے ہو۔ مگر اسمٰعیل سے نہیں چھڑا سکتے۔

"اس کے بعد میں نے وحشیوں کی ایک کشتی چرائی۔ اور اپنی پیاری مشتری

کو ساتھ لئے کر یہاں قریب ہی ایک چھوٹے سے جزیرہ سدا بہار میں جا رہا۔ اس میں بارہ مہینے پھول کھلتے۔ بھونرے اور تیتریاں اُڑتیں۔ خود رَو درختوں کی شاخیں لذیذ پھلوں سے لدی رہتیں۔ وہاں وحشیوں کی ناگوار آبادی کا نام نشان نہ تھا۔ چنانچہ ہم دونوں اس بہشت میں اس طرح رہنے لگے۔ جیسے آدم و حوّا باغِ ارم میں رہتے ہونگے۔

دس مہینے گزر گئے۔ اور گزرتے ہوئے معلوم بھی نہ ہوئے۔ اسکے بعد میرا دل اُچاٹ ہوگیا۔ ازدواج کے اوائل میں مرد کی محبت کا جوش و خروش حدِ انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اسکے بعد یہ دریا اُترنے لگتا ہے۔ وہ بیخودی۔ وہ ذوق۔ وہ ولولے کم ہونے لگتے ہیں۔ اب میرے لئے مشتری کا بادشاہ اور دیوتا ہونے میں کچھ لطف باقی نہ رہا تھا۔ تہذیب کے تمام سامان اور تمدن کی ساری نشانیاں مجھ سے چھن چکی تھیں۔ میرے تن پر کپڑا تک نہ رہا تھا۔ دس مہینے متواتر بیکار رہنے درختوں اور سمندر کی پیداوار پر گزران کرنے اور پتّوں کے بستر پر سونے سے طبیعت اُکتا گئی تھی۔

"ان ہی دنوں میں کوئی چھ وحشی کسی اور جزیرے سے سدا بہار میں آنکلے۔ میں اور مشتری دونوں نے ان سے جنگ کی۔ اور مارے لاٹھیوں کے ان کا قیمہ کردیا۔

"لیکن میں اس شاندار اور فاتحانہ جنگ کو بھی بہت جلد بھول گیا۔ وحشیانہ طرز زندگی سے میں ہلکان رُوح ہو رہا تھا۔ آخر میں نے مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ میں مشتری کو یہاں تنہا چھوڑ دوں۔ اپنی کشتی کو مضبوط بنا کر سمندر میں ڈالوں اگر قسمت یاور ہو۔ تو پھر تہذیب و تمدن کی دُنیا میں جا بسوں۔ اور سمجھ لوں

کہ سدا بہار ایک فردوس خواب تھا۔ اور مشتری ایک خندۂ خیال:

"میں نے مشتری سے کہا دیکھو۔ کل میں تمہارے وطن جزیرے میں جاؤنگا مجھے یاد پڑتا ہے۔ کہ میں اپنے ساتھ تختہ جہاز پر ایک پیٹی بھی لایا تھا۔ اس میں بہت اچھے اچھے زیور تھے۔ تمہاری محبت نے اس قدر از خود رفتہ کیا کہ وہ پیٹی وہیں بھول آیا۔ ممکن ہے۔ اب مل جائے۔ تو میں تمہیں قیمتی زیور پہنا کر سچ مچ اس جزیرے کی ملکہ بنا دوں۔ یہ میرا پہلا جھوٹ تھا۔

"مشتری نے اپنی بھولی بھالی آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اور کہا بہت اچھا۔ اسمٰعیل۔ جاؤ۔ میں تمہارے واپس آنے تک کنارے پر بیٹھی سمندر کی لہریں گنتی رہونگی۔ خدا کے لئے جلدی آنا۔ دوسرے دن صبح کو میں نے چرائی ہوئی کشتی کنارے پر سے کھولی۔ اس میں کود پڑا۔ مشتری اور سدا بہار پر الوداعی نگاہ ڈالی۔ اور کشتی کو کھینے لگا۔ شام کے وقت یہاں اس جزیرے میں پہنچا۔ اور ارادہ کر لیا کہ رات یہیں رہوں اور کل علی الصباح اپنی کشتی کو سمندر کی پر خطر موجوں کے رحم پر چھوڑ دوں۔ ممکن ہے۔ کہ کوئی جہاز نظر آجائے۔ اور وہ مجھے پھر دنیائے تہذیب میں پہنچا دے۔

"دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ کشتی کنارے کے پاس ایک درخت سے باندھی اور اتر کر سرکنڈوں کے ایک جھنڈ میں سو رہا۔

"غالباً آدھی رات گزر چکی ہوگی۔ میں دفعتہً نیند سے چونک اٹھا۔ اسے تم خیال کا اثر کہو۔ یا ضمیر کی خلاقی۔ مگر بھائی ارشاد۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہ میرے سامنے مشتری ایک نہایت خوبصورت بچہ لئے کھڑی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں ملیں۔ اور پھر نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ تو وہ نظارہ غائب تھا۔ لیکن میں سب کچھ سمجھ گیا اور خدا جانے کس قسم

کے جذبات سے متاثر ہو کر اس تاریک رات کی تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ مجھے طلبی کا وہ پیغام پہنچا تھا۔ جس کی تعمیل سے پہلوتہی کرنا کسی ہندوستانی دل سے ممکن نہیں۔ یہ وہ رشتہ ہے۔ کہ کوئی آدمی جسکی رُوح میں ذرا بھی ایشیائی پاکیزگی باقی ہے۔ اسے توڑنے یا اس کی طرف سے تغافل کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

"میں وہاں سے اُٹھا۔ سیدھا کشتی کی طرف گیا۔ اور سدا بہار کو روانہ ہُوا۔ شام ہونے کو تھی۔ کہ میں سدا بہار کے کنارے کے پاس پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کہ مشتری کنارے پر کھڑی لہریں گن رہی ہے جونہی اس نے مجھے دیکھا۔ کنارے کے پاس پانی میں کود پڑی۔ اور تیرتی ہوئی میری طرف آئی۔ میں کشتی کو زور سے کھے کر اس کے پاس لے گیا۔ مشتری کو کشتی میں بٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اور اس زور سے بھینچا۔ گویا ایک دوسرے کی رُوحیں بغلگیر ہو رہی تھیں۔ میں نے مُشتری کا مُنہ چُومنا شروع کیا۔ اور چُوم چُوم کے دیوانہ ہو گیا مُشتری نے میرے کان میں (بچے کی طرف اشارہ کر کے) اس بچّے کے پیدا ہونے کا مژدہ سنایا۔

"اس کے بعد اپنی تاراسی چمکتی آنکھوں سے میرے چہرے کو دیکھ کر کہنے لگی۔ میرے پیارے۔ تمہیں خوشی تو ہوئی ہو گی۔ اچھا یہ تو بتاؤ وہ پیٹی ملی؟ تم نے میرے لئے زیور کا وعدہ کیا تھا۔"

"میں نے دوسرا اور آخری جھوٹ بولا۔ پیاری مشتری۔ میں نے بہت تلاش کی۔ مگر پیٹی نہیں ملی۔ شاید ان جزیرے والوں نے اُڑائی ہو گی۔"

رواس کے بعد میں اور مشتری اپنی جھونپڑی میں گئے۔ میرے لئے بہت سی مچھلی اور بہت سے پھل مشتری نے فراہم کر رکھے تھے۔ میں آلتی پالتی مار کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اور سیر ہو کر کھانا کھایا۔ بس وہ دن اور یہ دن۔ میں درختوں پر چڑھنے والا جنگل کا درندہ۔ شکار کی ہڈیاں تک چبا جانے والا۔ غرضکہ ایک پورا وحشی ہوں۔

"ارشاد کسی نہ کسی طرح یہاں سے چھٹکارا پا کر چلے جاؤ۔ میرا ماجرا تمہارے لئے سرمایۂ عبرت ہے۔ مجھ میں انسانیت اور تہذیب کی جو ایک رمق باقی ہے۔ وہ مجھے مجبور کر رہی ہے۔ کہ میں تمہیں نصیحت کروں خدا کے واسطے یہاں سے چلے جاؤ۔ اپنی جوانی پر رحم کرو۔ بس اب میں جاتا ہوں۔ مشتری انتظار کر رہی ہوگی۔ یہ ناریل میں مشتری کی ماں کے لئے لایا تھا۔ لیکن اب چاہتا ہوں۔ کہ تم انہیں اپنے وحشی بھائی کا ہدیہ سمجھ کر رکھ لو۔ تمہارے دو چار دن ان سے کٹ جائینگے"۔

یہ کہہ کر اسمٰعیل اُٹھا۔ اور اپنے بچّے کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اُٹھایا۔ اور ارشاد اس کی داستان سُن کر ششدر رہ گیا۔ اور اس کے چہرے کی طرف دیر تک ٹکٹکی لگا کر دیکھتا رہا۔ آخر اسمٰعیل سلام کر کے رخصت ہُوا

ارشاد نے دیکھا کہ اسمٰعیل چُپ چاپ اپنے بچّے کو سینے سے لگائے کشتی میں بیٹھے آہستہ آہستہ اُفق کی طرف جا رہا ہے!

۳

زہرہ اپنے محبُوب ارشاد کے پاس آ کھڑی ہُوئی۔ اور اپنے دونو ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے۔ ارشاد نے وحشیانہ طور پر اسے جھٹک کر الگ کر دیا۔ زور سے ہنسا۔ اور کہنے لگا:۔

"زہرہ۔ اگر ہندی ایسے خوفناک ہوتے ہیں۔ تو تم مجھ سے اتنی محبت کیوں کرتی ہو؟ میں بھی تو ہندی ہوں۔ تم میرا خیال چھوڑ دو۔ اور میری جھونپڑی کی طرف نہ آیا کرو۔"

زہرہ۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) آہ! پیارے۔ تم مجھے بہت پیارے ہو دیکھو میں مر جاؤنگی۔ خدا کیلئے یہ ظلم نہ کرو۔ اور مجھے اپنی لونڈی بننے دو۔

ارشاد کی آنکھوں میں محبت کا نشہ چھا گیا۔ عشق کی بیخودی سے اسکے ہوش جاتے رہے۔ اس نے اپنی ٹوپی اُتار کے دُور پھینک دی کُرتے کا گریبان دونوں ہاتھ ڈال کر پھاڑ ڈالا۔ اور اس کی دھجیاں اُڑا دیں جُوتا اتار کر الگ کیا۔ اور اپنے سفید پاجامے کو گھٹنوں تک اُوپر چڑھا لیا۔

سُورج دورِ افق میں ڈوب رہا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں سمندر کی سطح اور جزیرے کی سرزمین کو ایک منظرِ زرّیں بنا رہی تھیں۔ شام کے پرندے چہچہا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ارشاد وحشیوں کی ایک کشتی میں بیٹھا تھا۔ زہرہ کا پیارا رخسار ارشاد کے خوبصورت فراخ سینے پر اور باہیں کمر میں تھیں۔ اور آغوشِ عاشق کی کیف انگیزی سے وہ بیہوش ہو رہی تھی۔

ارشاد نے کشتی کا بادبان کھول دیا۔ کشتی کسی اور سدا بہار جزیرے کی تلاش میں سمندر پر چل دی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے نیلے اُفق میں غائب ہو گئی۔

(کہکشاں)

ایثار

فطرتِ نسوانی کے ایک روشن پہلو کا مطالعہ

(از شیخ محمد ضیاء الدین صاحب شمسی)

"لیکن کوکب تمہیں اپنے فیصلہ پر مصر نہ رہنا چاہیئے"

ان الفاظ کی متکلمہ شیشے کے مشہور پارسی سوداگر سیٹھ بومن جی کی بیوی رتن بائی تھی جو اپنے بنگلہ کے آراستہ کمرہ میں ایک آرام کرسی پر بیٹھی اپنی خوبصورت لڑکی مس کوکب سے اُسکی شادی کے متعلق گفتگو کر رہی تھی۔ کوکب بیس سال کی نوجوان لڑکی اعلےٰ تعلیمیافتہ، نئے خیالات کی پرستار اور بالخصوص روشن خیال نسوانی جماعت کے اُس طبقہ سے تعلق رکھتی تھی جس نے جنس قوی کی اصلاح کو اپنا منتہائے نظر بنا رکھا تھا۔ سیٹھ بومن جی کے والد کے ۱۸۷۳ء میں بمبئی سے بغرضِ تجارت لاہور آئے تھے اور یہیں کے ہو رہے، نہ صرف پارسی سوسائٹی میں وہ اپنی شخصیت اور تمول کے لحاظ سے ممتاز تھے بلکہ عام طبقۂ تجار میں بھی اُنہیں اصولِ تجارت کی پابندی اور لین دین کے معاملہ کی صفائی کے باعث ایک امتیازی درجۂ عزت حاصل تھا۔ سیٹھ بومن جی کے صرف دو اولادیں تھیں، ایک لڑکا کیکاؤس جی جو عنفوانِ شباب ہی میں راہیٔ ملکِ عدم ہوا اور ۵ سال کی ایک ننھی سی لڑکی اپنی نشانی چھوڑ گیا اور دوسری کوکب جو اس وقت اپنی عمر کے بیسویں سال

میں تھی۔ کوکب کی تعلیم زیادہ تر بمبئی میں ہوئی تھی مگر انٹرنس کا امتحان اُس نے لاہور ہی کے ایک سرکاری مدرسہ میں اعزاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔ کوکب نہ صرف دلاویزی حسن کے باعث اپنی محدود برادری کے تمام افراد میں عزت و محبت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھی بلکہ وہ اپنے لحن خداداد کی بدولت ہر معاشرتی و مذہبی مجلس کیلئے وجہ زینت تصور کی جاتی تھی۔ کوکب ناکتخدا تھی اور چاہتی تھی کہ اگر اُسکے والدین اجازت دیں تو وہ سیٹھ ڈنشا کوپر کے لڑکے جہانگیر سے شادی کرلے لیکن سیٹھ بومن اور اُسکی بیوی دونوں کو اس رشتہ پر اعتراض تھا۔ جہانگیر اگرچہ متمول باپ کا لڑکا تھا۔ مگر اپنی بُری عادات کی بدولت تمام برادری میں بدنام و رسوا ہو چکا تھا۔ سخت شرابی۔ جوئے کا رسیا اور طرہ یہ کہ بیکار۔ لیکن تھا نہایت وجیہہ و خوبصورت اُسکی رسیلی آنکھوں میں عشق و محبت کا وہ کیف تھا کہ ایک ہی نگاہ میں دیکھنے والے کو سرشار و بیخود بنا دے۔ کوکب کو اُس سے محبت ضرور تھی لیکن سب سے زیادہ خیال اس بات کا تھا کہ وہ اپنے پاکیزہ چلن اور قوت ارادی سے جہانگیر جیسے بدچلن آدمی کو شریف النفس اور فرشتہ خو انسان کے سانچے میں ڈھال کر دیگر مستورات کے سامنے ایک قابل تقلید مثال قائم کردے کہ کس طرح عورت کا کمزور و نازک ہاتھ جنس قوی کی درستی و اصلاح کی قابلیت رکھتا ہے۔ جہانگیر میں گو سینکڑوں برائیاں تھیں مگر وہ بھی کوکب کو سچے دل سے چاہتا تھا بایں ہمہ کوکب کے والدین کو یہ رشتہ سخت ناگوار تھا۔ سیٹھ بومن نے کئی دفعہ سمجھایا۔ ماں نے کئی کئی گھنٹے تک تلخی و نرمی سے کہا مگر بے سود کوکب پر جہانگیر کے عشق کا جادو چل چکا تھا۔ وہ ماں کے ہر فلسفیانہ فقرہ کا یہ جواب دیتی "امی جان مجھے جہانگیر کی نسبت سب باتوں کا علم ہے لیکن میں آپکو یقین دلاتی ہوں کہ میرے ساتھ رہنے کے بعد وہ بالکل درست ہو جائیگا"۔

کوکب کے مُنہ سے یہ الفاظ سُن کر تجربہ کار عورت کا ماتا بھرا دل جل جاتا اور وہ محسوس کرتی کہ جوانی کے نشہ نے بھولی بھالی معصوم لڑکی کو از خود رفتہ بنا رکھا ہے کوکب اگرچہ اس شادی کے نتائج سے آنکھیں بند کئے ہُوئے تھی لیکن اُسکی جہاندیدہ ماں کے سامنے ایسی محبت آمیز شادیوں کی کئی پُر مذلت مثالیں موجود تھیں جہاں شرافتِ مجسم لڑکیاں ایسے اوباش مزاج انسانوں کے ہاتھوں میں اپنی قسمت کی باگ دے کر عمر بھر کیلئے نصیبوں کو رو رہی تھیں۔ ایک شام کھانے سے فارغ ہو کر ماں بیٹیاں گول کمرہ میں بیٹھی اسی مبحث پر گفتگو کر رہی تھیں کہ ادھیڑ عمر کی عورت نے اپنی آنکھوں پر چشمہ درست کر کے کہا "لیکن کوکب تمہیں اپنے فیصلہ پر مُصر نہ رہنا چاہیئے"۔

یہ کہہ کر وہ ایک منٹ کیلئے خاموش ہو گئی معاً دوسرے لمحہ میں اپنی نشست درست کر کے بولی "کیا والدین کا حقیقی اولاد پر کوئی حق نہیں ہوتا کہ وہ اُنکی مرضی کے خلاف عمر بھر میں ایک بات بھی منوا سکیں اور بالخصوص ایسی حالت میں کہ وہ اُنہیں کی بہتری کیلئے ہو۔ عزیز من ہمیں تمہارے ساتھ کوئی عداوت تو ہے نہیں جو تم یوں ضد کئے جاتی ہو...... کیا تم انکار کر سکتی ہو کہ ایسی بے جوڑ شادیاں ہمیشہ ناکام رہی ہیں اور طرفین کے لئے باعثِ رنج و الم؟"

ماں کے ترش لہجہ سے متاثر ہو کر کوکب کرسی پر سیدھی بیٹھ گئی اور اخبار کو ایک تپائی پر رکھ کر حیرت و استعجاب سے اُسکے تمتمائے ہُوئے چہرہ کی طرف دیکھنے لگی۔ پیشتر اسکے کہ وہ اپنی زبان سے کوئی کلمہ نکالتی بوڑھی عورت نے بلند آواز میں کہا "اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ والدین کی نافرمانی کا ایک نتیجہ تو ابدی مصائب میں مبتلا رہنا ہے اور دوسرے...... دوسرے باپ کی ریاست سے بھی محروم ہو گی جو وراثتاً تمہیں پہنچتی"۔

گو یہ الفاظ کوکب کی عزتِ نفس کو مجروح کرنیکے لئے کافی تھے مگر وہ ایسے اوچھے ظرف کی عورت نہ تھی کہ اتنی سی گفتگو سے مشتعل ہوکر اپنے پائے ثبات میں لغزش پیدا کرلیتی اُسکے پیشِ نظر ایک کام تھا، ایک شریف ترین کام یعنی ایک شخص کی زندگی بنانیکے لئے اپنی زندگی تباہ و برباد کردینا لیکن اس قسم کی معمولی دھمکیاں غالباً ایسے اشخاص کیلئے ہمیشہ بیکار سمجھی گئی ہیں جنکا منتہائے نظر جان بیچ کر کسی محبوب مقصد کا حاصل کرنا ہو۔ اور کوکب کے معاملہ میں بھی ایسا ہوا اور ایسا ہونا چاہیئے تھا۔ جب ہر نوع کی دھمکیوں کا منتر کوکب کے سحرِ عزم و ثبات کو باطل نہ کرسکا اور ہر ایسا حربہ جو اس جنگ میں استعمال ہوسکتا تھا۔ ناکام ثابت ہوا تو سیٹھ بومن اور اُسکی بیوی نے چار و ناچار کوکب کو اجازت دیدی کہ وہ جس سے چاہے شادی کرلے۔

اس فیصلہ کے تین ماہ بعد جب کوکب کا عروسی جوڑا بالکل تیار ہوچکا تھا اور اُسکی سہیلیوں نے مراسمِ نکاح کے بعد گانا بھی اچھی طرح یاد کرلیا تھا اور اُس وقت کہ دعوت کے تمام خطوط بھی تقسیم ہوچکے تھے رات کے دس بجے کے قریب ایک منحوس خبر نے جامِ آرزو کو ٹھکرا کر مسرت و شادمانی کی ساری مے بہادی۔ اور سازِ محبت کے سرور انگیز نغمے موت کی بھیانک چیخوں میں تبدیل ہوگئے ——— جہانگیر نے نشہ کی حالت میں اپنے ایک دوست کے منہ سے کوکب کے خلاف کوئی ناشائستہ فقرہ سُن کر اُسے پستول سے ہلاک کردیا تھا۔

اِس خبرِ وحشت اثر نے سیٹھ بومن کے تمام گھرانے کو وقفِ رنج و الم کردیا۔ اور کوکب کی تو پوچھیئے ہی نہ کہ کن خیالوں میں غرق تھی سیٹھ بومن اُسی وقت سوار ہوکر ڈنشا کوپر کی کوٹھی پر گئے تو معلوم ہوا کہ جہانگیر پولیس کی حراست میں ہے۔ اور یہ سُن کر اور بھی رنج ہوا کہ ڈاکٹر اُردشیر کی بجائے، جسکے منہ سے اشتعال انگیز

الفاظ نکلے تھے، گوبی رستم جی کے سینے میں لگی جو بمبئی کے مشہور سوداگر خان بہادر سیٹھ سہراب جی کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اور چند روز کیلئے تجارتی اغراض کی خاطر لاہور آیا تھا۔ رات کے دو بجے کے قریب سیٹھ بومن اپنی کوٹھی کو واپس ہوئے اور بیوی اور لڑکی کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا۔ رات تو جوں توں آنکھوں میں کٹی اور صبح سویرے ہی سے مقدمہ کی تیاریاں ہونے لگیں مگر قسمت کی بدنصیبی دیکھئے کہ اس واقعہ کے دو ماہ بعد جب سشن جج کی عدالت سے جہانگیر کیلئے موت کی سزا تجویز ہوئی تو سیٹھ ڈنشا کو پرکا دیوالہ نکل گیا اور مقدمہ لڑنے والوں کے حوصلے اور زیادہ پست ہو گئے۔ بالآخر ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء کو جمعرات کے روز ۲ دو بجے کے قریب لنچ سے فارغ ہو کر عدالتِ عالیہ چیفکورٹ پنجاب کے فاضل ججوں نے نوجوان قاتل کی جوانی پر رحم کھا کر اُسے صرف بیس سال کی قیدِ بامشقت کا حکم سُنایا۔

اُس وقت جبکہ جہانگیر حسرت و حرماں کی ایک دُنیا پہلو میں لئے آنکھیں جھکائے، ایک مردانہ ثبات و استقلال کے ساتھ جیل کی آہنی گاڑی میں سوار ہونے کو تھا، کوکب اشکبار آنکھوں کے ساتھ اُس کے قریب آئی اور بھرائی ہوئی آواز میں ہچکی لے کر بولی "خدا ——— حافظ"

جہانگیر نے اشکہائے ندامت سے بھیگی ہوئی پلکیں اُٹھا کر اُس انبوہِ کثیر کی طرف دیکھا جو ہمدردانہ طور سے اُسکے اردگرد ہجوم کئے تھا اور اُسکی دوسری نظر اپنے والد کے متین و باوقار چہرہ کی طرف گئی لیکن اُسے جرأت نہ ہو سکی کہ وہ اُن شفیق آنکھوں کی طرف ایک لمحہ کیلئے بھی دیکھ سکے جو اشکہائے غم کا ایک سیلاب روکے کھڑی تھیں دُنیا اُسکی آنکھوں میں اندھیر ہو رہی تھی۔ وہ اپنی آستین سے آنسو پونچھ کر کوکب کے کملائے ہوئے چہرہ کی طرف

دیکھنے لگا جو گردن جھکائے اُن آہنی کڑیوں کی طرف دیکھ رہی تھی جو جہانگیر کے ہاتھوں کی بجائے اُسکے کسی دشمن کے ہاتھوں میں ہونی چاہئیے تھیں ,, کوکب،، جہانگیر کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں سے نکلا ''میں تم سے معافی چاہتا ہوں کہ تمہاری اس قدر رسوائی کا باعث ہُوا،،

کوکب نے بادیدۂ نم اُسکے چہرہ کی طرف دیکھا، بلوری آنسو اُسکی خوبصورت آنکھوں میں یوں دکھائی دیتے تھے جس طرح چودھویں رات کا مکمل چاند خاموش جھیل کی پُرسکون لہروں میں چمک رہا ہو۔ وہ اپنے سر سے ڈھلکی ہوئی ساڑھی درست کرکے بولی ''میں شرمندہ ہوں کہ میری نحوست نے تمہیں یہ روزِ بد دکھایا، لیکن جہانگیر اگر میں زندہ رہی تو ان تہمت تراشیوں سے تمہارے دامنِ شہرت کو ملوث نہ ہونے دونگی جسکی پاداش میں ہم اتنے سالوں کے لئے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو رہے ہیں،،

کوکب کے ان الفاظ سے جہانگیر کا ملول و غمگین دل بدرجہ اتم متاثر ہُوا۔ اور اُس مجسمۂ وفا کو راہِ محبت میں یوں سربکف پا کر کہنے لگا کوکب میری پیاری میں کس طرح تمہیں اپنا دل چیر کر دکھاؤں کہ مجھے تم سے کس قدر محبت ہے مگر جب قضاؤ قدر کو ہماری کامرانی ہی منظور نہیں تو میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم جس سے چاہو شادی کر لینا،،

ان الفاظ کے ساتھ آنسوؤں کی ایک رُو تھی کہ اُسکی آنکھوں سے بہہ نکلی۔ اس وقت کوکب خود بھی اُس آتشِ محبت کی تپش کو محسوس کر رہی تھی جو جہانگیر کے اد باش دل میں شعلہ زن تھی بالآخر وہ اپنے برانگیختہ جذباتِ عشق کو سینے میں سنبھال کر بولی ''نہیں۔ اگر تمہیں مجھ سے اتنی ہی محبت ہے تو میں بیس سال تک تمہارا انتظار کرونگی،،

کہنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا فقرہ تھا مگر اسکی تہ میں دُنیا دی مصائب اور جذباتِ جاں نثاری کا طوفانِ عظیم پنہاں تھا۔ کوکب کے خون کا ہر قطرہ اس وقت سیماب وار تڑپ رہا تھا۔ اُسکی بے پناہ آنکھوں کی چمک ناقابلِ برداشت تھی اور اسکی حسین پیشانی نورِ عفت سے تابندہ اور اُسکے چمپئی رُخسار جذبۂ وفاداری سے کُندن کی طرح چمک رہے تھے۔ ان الفاظ کے سُنتے ہی چند لمحوں کے لئے جہانگیر کا سارا تردد و اضطراب ایسے جاتا رہا جس طرح کسی مجروح دل کو نغمۂ جانفزا کی لطافتیں احساسِ الم سے بیگانہ بنا دیتی ہیں۔ وہ کوکب کی عادات سے اچھی طرح واقف تھا کہ ایسے عزمِ صمیم کی عورت کن جذباتِ عالیہ کی مالک ہوتی ہے اور اُسکی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ ان الفاظ کے ساتھ کوکب کا دل اُسکے لبوں پر اور اُسکی رُوح سمٹ کر رسیلی آنکھوں میں مجتمع ہو رہی تھی۔ جہانگیر کو یقین تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے بالکل سچ تھا اور اس سے پیشتر کہ وہ زمانۂ آئندہ کی زرّیں اُمیدوں اور سنہری خوابوں سے معمور دل و دماغ کو سنبھال کر گاڑی میں سوار ہوتا اُس نے کوکب کے ہونٹوں پر بوسہ دیا اور باپ سے گناہوں کی معافی مانگ کر سب کو خدا حافظ کہتا ہُوا بیس سال کیلئے علیحدہ ہو گیا۔

انتظار کے ان طویل سالوں کا بسر ہونا ہر ذی عقل انسان کے نزدیک غیر ممکن تھا بیس سال ..... اور خود کوکب کی عمر اُس وقت بیس سال کے قریب تھی۔ انتظار کے پہلے چند مہینوں ہی میں اُس پامال یاس کو معلوم ہو گیا کہ نہ گذرنے والا وقت ایک تیز تلوار کے مانند دن رات کے چوبیس گھنٹے اُسکے دل و دماغ کو زخمی اور اُسکی بے لوث رُوح کو گھائل کئے دیتا تھا۔ ہر ایسے نہ گذرنے والے دن کی لمبی ساعتیں عنکبوت کی طرح اُسکے بدن پر رینگتی نظر آتی تھیں اور سعیٔ بلیغ کے باوجود وہ اپنے جسم سے انہیں علیحدہ نہ کر سکتی تھی اور بجائے اسکے کہ وہ اُسکے

بدن سے رینگ کر گزر جاتیں کو کب ایسا محسوس کرتی تھی کہ اُسکے گوشت کے ساتھ مرنے کے بعد بھی چمٹی ہُوئی ہیں۔ سوگوار تاثرات کے ابتدائی ایام میں وہ اپنی روح کو "انتظار" کے تشدد سے محفوظ رکھنے کی خاطر ایسے کٹھن کاموں میں مشغول رہنے لگی جنکے لئے اس سانحۂ رُوح فرسا کے چند روز پہلے تھوڑے سے منٹ وقف کر دینا اُسکے نزدیک تضیع اوقات کا مماثل تھا۔ اُسکے نازک ہاتھ نہ تو باغ کی روشوں کے درست کرنیکے قابل تھے نہ پانی سے لبریز ٹین کا برتن اُٹھا کر پھُولوں کے گملوں میں پانی دینے کے لائق وہی گلہائے رنگ رنگ جو اُسکے لئے ہزاروں دلچسپیوں کا سامان مہیا کرتے تھے اُس مقصودِ زندگی کی غیر حاضری میں کاغذ کے پھُول معلوم ہوتے تھے، خوشبو سے معرا اور اپنی رنگین لطافتوں سے بیگانہ، لیکن ان لاحاصل مشقتوں کو برداشت کرنیکے بعد جب اُسے خیال آتا۔ کہ ابھی مصائب و آلام کے بیس سال اور ہیں تو اُسکی رُوح لرز جاتی اور غیر محسوس طور پر اُسکی پلکیں نمدار ہو جاتیں، وہ سوچتی کہ کس گناہ کی پاداش میں اتنے طویل عرصہ کے لئے وہ آتشِ فراق کے دہکتے ہُوئے جہنم میں جھونک دی گئی ہے +

بالآخر جوں جوں وقت کٹتا گیا اُسی قدر دردِ فراق کی شدت میں کمی ہوتی گئی اگرچہ آخری وقت تک کشاکشِ انتظار نے لذتِ خلش کو کم نہ ہونے دیا۔ خدا خدا کر کے پانچ سال بسر ہُوئے مگر پچاس بن کر ـــــ ابھی پندرہ برس باقی تھے اور وہ بھی انتظار کے پندرہ۔ اُس قیدِ تنہائی کے پندرہ سال جس کے اختتام پر اُس کی بہارِ حُسن کا خاتمہ اور گلستانِ جوانی کی بربادی لازمی تھی۔ پچیس برس کی عمر میں اُسکا قیامت خیز شباب انتہائی عروج پر تھا اور ہر شخص کو اسکا علم ہونے کے باوجود کہ وہ اپنی زندگی اور اپنے حُسن و شباب کو "وفاداری" اور "عشق و محبت" کے دیوتا کی نذر کر چکی ہے۔ بیسیوں نوجوانوں نے اُسے رام

کرنیکی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ایک کی ہو چکی تھی اور مرتے دم تک اُسی کیلئے جینا اپنا مقصدِ حیات تصور کرتی تھی۔

سال میں چار دفعہ وہ منٹگمری کے سنٹرل جیل میں اُسے دیکھنے جاتی اور سال میں چار دفعہ وہ اُسکے چہرہ کے مدہم نقوش کو ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اِس طرح دیکھتی گویا جہانگیر کسی تیز بہنے والی پہاڑی ندی کے صاف ستھرے پانی کی گہرائیوں میں مصروفِ کلام ہے۔ پانچ سال کی جبری مشقت نے اُسکے چہرہ کی جاذبیت اور مردانہ حسن کو فنا کر دیا تھا۔ اُسکی مسحور کرنے والی آنکھیں جو عورتوں کے دلوں کو زخمی کرنیکے لئے تیر و نشتر کا کام دیتی تھیں اپنی تمام صفات سے معرّا ہو چکی تھیں اور اُسکے پھول جیسے رُخساروں پر بکثرت موٹے موٹے بال اُگ رہے تھے۔

اس واقعہ کے دس سال بعد جب کوکب کا باپ بسترِ مرگ پر تھا تو اُس نے کئی بار اس سے کہا "کوکب کیوں زندگی کی عزیز ترین گھڑیاں ایک موہوم اُمید کی خاطر برباد کر رہی ہو اس ضد اور ہٹ کو چھوڑ دو۔ میں نے اتنے سال تک تمہارے "غم" کا احترام کیا ہے اور یہ میری آخری خواہش ہے کہ مرنے سے پہلے تمہیں کسی ایسے شریف انسان کے رشتۂ مناکحت میں دیکھوں جو میرے بعد تمہاری نگہداشت کر سکے"

کوکب اگرچہ نہایت شریف طبیعت اور پاکیزہ مزاج کی عورت تھی اور اپنے والد کی خواہشات کو احکامِ سماوی سے کم نہ سمجھتی تھی مگر اس معاملہ میں وہ کسی مداخلت کو پسند نہ کرتی تھی اور آج سے دس سال پہلے جس طرح سیٹھ بومن نے معذور ہو کر اس کی شادی کے خیال کو دل سے محو کر دیا تھا اُسی طرح وہ اس ارمان کو سینے میں لئے ہمیشہ کیلئے اِس دارِ فانی سے رحلت کر گیا۔

اب بھی حسبِ دستور وہ سال میں چار دفعہ اُس سے ملنے جاتی مگر اب دونوں کے سینوں میں محبت کی وہ پہلی سی گرمی نہ تھی البتہ وضعداری کی راکھ کے نیچے سچے عشق کی چنگاری ضرور سُلگ رہی تھی۔ دس سال کے عرصہ میں دونوں کی مضطرب رُوحوں کو بہت کچھ سکون و قرار حاصل ہو چکا تھا مگر یہ قرار محسوس طور پر جہانگیر کی سرد مہری میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اب محبت کی شعلہ نوائیوں کی بجائے وہ ایک دوسرے کا مُنہ دیکھتے رہتے کیونکہ اُنکے پاس گفتگو کیلئے کوئی نیا موضوع ہی نہ تھا۔ بالآخر یہ "خامشی" آہستہ آہستہ اُنکے درمیان اُس ندی کی طرح پھیل گئی جو کوکب کے عہدِ شباب کی وسعتوں میں بڑھتے بڑھتے متلاطم دریا کی صورت اختیار کر چکی تھی اور جوں جوں وہ تیزی و روانی سے بہے چلی جا رہی تھی اُسی قدر کوکب اپنا ہاتھ جہانگیر کی جانب بڑھانے سے معذور تھی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اُس نے ملاقات کے مقررہ اوقات میں ایک پل کی تبدیلی بھی گوارا نہ کی۔ یہانتک کہ جب اُسکی آخری دلچسپی ——— اُسکی ماں بسترِ مرگ پر پڑی ہمیشہ کیلئے اُسے داغِ جدائی دینے والی تھی اور یہانتک کہ جب وہ خود کسی جسمانی عارضہ سے شفا پا کر ہسپتال سے رخصت ہو رہی تھی تو ڈاکٹروں نے منع کیا جہانگیر کے ساتھ کسی قسم کی ملاقات بھی اُسکی زندگی کو خطرہ میں ڈالدیگی، اُس وقت بھی وہ نہ رُکی اور منٹگمری تک کا پُرصعوبت سفر کرنے سے باز نہ رہ سکی۔

کوکب کی زندگی کے دن یکے بعد دیگرے یوں خاموشی کے ساتھ گزرے جا رہے تھے جس طرح درخت کے پتے موسمِ خزاں میں یکے بعد دیگرے گر گر کر آبجو میں بہے چلے جاتے ہیں۔ انتظار کے پندرہ سال پُورے ہو چکے تھے اور اس عرصہ میں دُنیا گرگٹ کی طرح کئی رنگ بدل چکی تھی۔ بیٹیاں مائیں بن چکی

تھیں اور مائیں قبروں میں آرام کی نیند سو رہی تھیں۔ اقوام کی محشر خیز جنگ شروع ہو کر ختم ہو چکی تھی اور کئی چھوٹے مذہبی و سیاسی دیوتا آکر واپس جا چکے تھے، راعی کا تشدد، رعایا کی بغاوتیں، آزادی کی کوششیں غرضکہ ہنگامہ زار دنیا کی ہر شورش شروع ہو کر ختم ہو چکی تھی لیکن کوکب کے مشاغل اور اُس کی طبیعت کی سادگی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ البتہ شباب کی دوپہر ڈھل رہی تھی، لیکن نہایت رنج و تاسف کے ساتھ ــــ کل کی بات ہے کہ کوکب کی بھتیجی فیروزہ پانچ سال کی چھوٹی سی لڑکی تھی مگر اُس "وقت" نے جس نے کوکب کے شباب میں انحطاط پیدا کر دیا تھا اس چھوٹی سی لڑکی کے نہال طفلی میں حسن و جوانی کے شگوفے پیدا کر دئے تھے۔ بے سمجھ معصوم لڑکی اب اچھے تن و توش کی خوبصورت عورت تھی اُسے بھی اس بات کا احساس تھا کہ اُسکی خالہ کسی شخص کیلئے اپنی زندگی تباہ کر چکی ہے اور اپنی دادی کے یہ الفاظ اُسکے کانوں میں ابھی تک گونج رہے تھے کہ کوکب بیس سال کیلئے بیوہ ہو چکی ہے اور اسوقت کہ عذاب قبر سے زیادہ سخت "انتظار" کی طاقت سلب ہو جانی چاہیئے تھی۔ تب بھی وہ اُسکی منتظر تھی۔

زندگی کے پندرہ سالوں کے ساتھ ساتھ ہر چیز نیا پہلو اختیار کرتی گئی اور آج سے صرف پندرہ ہی برس پہلے جب کوکب نے جہانگیر سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بیس سال تک اُسکا انتظار کریگی تو مردوں اور عورتوں نے متفقہ طور پر کہا تھا کہ ایسے نیک قماش کی عورتیں دنیا میں بہت کم پیدا ہوتی ہیں لیکن آج نئی تہذیب کی روشنی میں پلی ہوئی فیروزہ اس لامتناہی انتظار کو "حماقت" کے نام سے تعبیر کرتی تھی اور خود کوکب کو بھی بتدریج اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ اس حیات الم، اس دشمنِ شباب "انتظار" اس خود فراموشی، اس ناکامی تمنا کا کیا فائدہ تھا۔

یہی نا کہ ایک ایسے شخص کی خاطر اپنی عزیز زندگی بے فائدہ تباہ و برباد کر دی جسے نہ اس کا ایثار درست کر سکا اور نہ اُسکی قوتِ ارادی دنیا میں کامیاب انسان بنا سکی۔ اُسے اب ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شیشے کے ایک بڑے گلوب کے نیچے وہ قید کر دی گئی ہے۔ تھوڑے عرصہ کے لئے نہیں، بیس سال کیلئے اور عمر کے بہترین حصّہ میں جس سے انسان کی زندگی کے اہم ترین مقاصد وابستہ ہوتے ہیں اور جس پر اُس کی زندگی کا سارا مدار ہوتا ہے۔

اُنیس سال گذر گئے اور کوکب کو ڈھارس بندھنے لگی اب اُس کی آزادی کا وقت قریب ہے اُس وقت وہ اپنی عمر کے اُنتالیسویں سال میں قدم رکھ رہی تھی۔ شدتِ رنج والم اور کاہشِ فراق نے اُسکی خوبصورت آنکھوں کے گرد چھوٹے چھوٹے حلقے پیدا کر دئے تھے اور اُسکے گلاب جیسے سُرخ رُخسار کپاس کے پھولوں کی طرح زرد ہو چکے تھے۔ فیروزہ اب بالکل جوان تھی اور ایک خوبرو پارسی زادہ سے اُسکی نسبت بھی ہو چکی تھی ۲۹ جون ۱۹۲۳ء کو اُس کی شادی کا دن تھا اور اُسی رات نکاح کے بعد لڑکے کے والدین نے اپنے عزیزوں کو چاندنی رات میں دریائے راوی پر کشتی کی سیر کے لئے مدعو کیا تھا اور یہ بات طے ہوئی تھی کہ ریل کے پُل سے گذر کر دریا کے اوپر کی طرف ایک میل تک جائیں اور نصف شب تک یہ ہنگامۂ لُطف و نشاط قائم رہے۔

نو بجے کے قریب جب چاند کی سفید و مصفا چاندنی نے دامنِ دُنیا سے رات کی سیاہی کو دھو ڈالا تو حُسن و شباب کا یہ مختصر سا مجمع موٹر گاڑیوں میں سوار ہو کر دریا کی طرف چل دیا اور عین اُس وقت جبکہ کوکب اپنی سفید ساڑھی کو ایک متین اور زاہدانہ انداز سے سنبھال کر موٹر کے پائدان پر پیر رکھنا

چاہتی تھی۔ تار کے ہرکارہ نے اُسے سلام کر کے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔
”حضور کا ایک تار ہے“
کوکب نے تار لیکر ایک لمحہ کے لئے سرنامہ پر نظر ڈالی پھر چپراسی کی رسید بہی پر دستخط کر کے اُسے کھولا تو یہ الفاظ نظر آئے۔
”ایک سال کی قید معاف، مَیں بذریعہ موٹر کار صبح چار بجے لاہور پہنچوں گا۔ جہانگیر“
کوکب چند لمحوں تک دم بخود ہو کر تار کے الفاظ کو بار بار پڑھتی رہی اور اس عرصہ میں اُسے یہ معلوم بھی نہ ہُوا کہ وہ کہاں کھڑی ہے اور خدا معلوم وہ اس تذبذب، اس امید و بیم اور اس ذہنی کشمکش کی حالت میں کتنا عرصہ محو رہتی لیکن فیروزہ کی ترنم ریز آواز نے اُسے اپنے خواب سے چونکا دیا۔ جو نہایت بھولی صورت بنا کر کہہ رہی تھی ”خالہ کوکب آخر اس تار میں ہے کیا جو آپ اتنی آزردہ خاطر ہو رہی ہیں۔ کس کا تار ہے“؟
کوکب نے تار کے مضمون کو پریشاں نگاہوں سے ایک بار پھر پڑھا اور تہ کر کے قمیص کی جیب میں رکھ لیا، پھر منفعل نگاہوں سے اپنی بھتیجی کے ملائک فریب چہرہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگی ”مانک شاہ کا تار تھا تمہاری شادی پر مبارکباد لکھی ہے اور میں حیران ہو کر یہ سوچ رہی تھی کہ اتنے عرصہ کے بگڑے ہُوئے تعلقات کو شاید از سرِ نو استوار کرنا چاہتے ہیں“ یہ کہکر وہ گاڑی میں سوار ہو گئی اور یہ دیکھ کر کہ نہ تو دُلہن، نہ دُولھا اور نہ اُسکی بہن اس معاملہ میں کسی دلچسپی کا اظہار کر رہے ہیں وہ بالکل خاموش ہو کر محسوس کرنے لگی کہ آج ذرا سی بات کے لئے اُس نے عمر بھر میں پہلی دفعہ جھوٹ بولا ہے۔ لیکن وہ اپنے یا جہانگیر کے متعلق کسی راز کے انکشاف کے ساتھ

اس قصۂ پارینہ کو جو بہت حد تک لوگوں کے دلوں سے فراموش ہو چکا تھا
از سرِ نو تازہ کرنا نہیں چاہتی تھی، تاسف و رنج اور رسمی ہمدردی کے مخصوص
الفاظ وہ سینکڑوں زبانوں سے سُن چکی تھی جو نہ تو اُسکے اندوہِ فراق کا مداوا
تھے نہ اُسکے دل کی بیکلی کا علاج۔ اس وقت اگر اُسے کسی بات کی خواہش
تھی تو یہ کہ وہ کسی طرح گھر واپس چلی جائے اور اُس شخص کے راحت و آرام کا
سامان مہیا کرے جو ایک گمنام فقیر کی طرح اُنیس سال کی قیدِ طویل سے نکل
کر آرہا ہے، جس کی عدم موجودگی میں اُسکے باپ کی ساری جائداد دیوالہ کی
نذر ہو چکی تھی اور جس کے غمگساروں اور ہمدردوں کا طبقہ صرف اُسی کی ذات
تک محدود تھا۔ اُس تک جو اُسے دل و جان سے چاہتی تھی اور جو اُنیس سال
کی پُر ارمان زندگی اُسکے فراق و انتظار میں اسی دن کی موہوم اُمید کی خاطر
قربان کر چکی تھی۔

لیکن وہ اب کس شکل و صورت کا ہوگا وہ بار بار دل میں سوچتی اور
اس رُوح فرسا منظر کو بار بار آنکھوں کے سامنے لاتی جب اُس نے آخری
دفعہ دُنیائے عشق و محبت کی رونق کو زندان خانہ کی آہنیں سلاخوں کے
اندر دیکھا تھا ——— ایک نحیف و زار انسان، زرد رو، ایسا معلوم ہوتا
تھا کہ سالہا سال کا بیمار ہے کہ موت کی گھڑیاں گن رہا ہے اور یہ اُس نوجوان
کی حالت کا نقشا تھا جو میخانۂ حیات کا ساقی اور چمن زارِ دُنیا کی بہار تصور
کیا جاتا تھا۔ لیکن آہ! شراب کی کثرتِ استعمال اور حد سے زیادہ تمباکو نوشی
نے اُسے اس حالت تک پہنچا دیا تھا۔ باایں ہمہ کوکب اب بھی اُسے سچے دل
سے چاہتی تھی اور اُسکی خمار زا پلکوں کے دامن میں مسرت و شادمانی کے آنسو
مچل رہے تھے۔

ساڑھے نو بجے کے قریب دولھا کی موٹر راوی پارک کے آہنیں پھاٹک کے اندر داخل ہوئی جہاں دریا کے کنارے چاند کی چاندنی میں مہ طلعت دوشیزہ لڑکیوں کا جمگھٹا ایک طرف مصروف تکلم تھا اور دوسری طرف چند نوجوان مسلمان ملاحوں کے ساتھ مل کر کشتیوں کی تیاری اور صفائی میں مشغول تھے۔ ان سب سے علیحدہ سن رسیدہ مرد اور عورتیں موسم کی حدت، صحت بخش ہوا اور منظرِ کنارِ دریا کے متعلق گفتگو کر رہے تھے، چنانچہ آدھ گھنٹہ کی بحث تمحیص کے بعد کہ ۳۴ مردوں عورتوں کا مجمع نو کشتیوں میں کس طرح تقسیم ہو کر سوار ہو "دادا ہرمز" کے نعروں اور خوف و انبساط کی طرب انگیز چیخوں کے ساتھ دریا کی پُرسکون لہروں میں حرکت پیدا ہوئی اور تمام کشتیاں ایک خاص انداز خرام کے ساتھ روانہ ہو گئیں۔

وائیلن اور ہارمونیم کے ترنم ریز نغمے دریا کے سکوت مردہ میں حیاتِ مسرت کی لہر پیدا کر رہے تھے اور روح فروز گیتوں کی تانیں فضائے بسیط میں گونج کر مدّو جزر روح کیلئے باعثِ سکون و قرار بن رہی تھیں۔ ساغرِ قمر سے بادۂ نور کا زرّیں سیلاب اور ملبوساتِ زر نگار کی عنبر آفریں نگہتیں حساس دلوں کو از خود رفتہ و مدہوش بنا رہی تھیں اور مہوشانِ صبیح کی رنگین ساڑھیوں کا عکس راوی کی سطح ہموار پر عکس فگن ہو کر اسکی نیلگوں لہروں کو موجہائے بادۂ گلرنگ میں تبدیل کر رہا تھا۔ چنانچہ ایک گھنٹہ کی زور آزمائی و جدوجہد کے بعد موضع جھگیاں کے قریب ایک کھلے مقام پر کشتیاں کنارے لگا دی گئیں اور سب مہمان ریگزار پر صاف ستھری دریاں بچھا کر فواکہات اور مشروبات یخ بستہ سے پیاس بجھانے لگے۔ ایک گھنٹہ کے کھیل کود اور تفریح کے بعد لڑکوں میں کشتی کھینے کے مقابلہ کا سوال پیدا ہوا اور سب نوجوان اپنے اپنے

طرفداروں کو بٹھا کر روانہ ہو گئے۔ اس دخمہ کشتیوں میں چار چار آدمی بیٹھے۔ اور آخری کشتی میں کوکب اور ڈاکٹر اُردشیر کو جگہ ملی۔ اسے اتفاقِ وقت کہئے یا کوکب کی بدقسمتی کہ اُسے ایسے آدمی کے ساتھ تنہا کشتی میں سوار ہونے کا موقع ملا۔ جس کے سرد و آدمیوں کی زندگی تباہ کرنیکا الزام دھرا جا سکتا تھا۔ آٹھ کشتیاں آن کی آن میں ایک موڑ مُڑ کر کوکب کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں اور ہر طرف ایک خامشی سی چھا گئی لیکن اُسکے تصور میں بلند قہقہوں کی آوازیں شہتوت کے گھنے ذخیرہ، شیشم اور کیکر کے مخلوط جھنڈ میں ابھی تک گونج رہی تھیں۔ نورفشاں چاند ایک قسم کے دھندلکے میں منہ لپیٹے اُونگھ رہا تھا۔ جنگل کے گیدڑوں اور مختلف دریائی جانوروں کی آوازیں یا اُردشیر کے چپوؤں کی صدا اس خاموشی اور اُداسی کے طلسم کو توڑ رہی تھی۔ ہلکی سی کشتی اُردشیر کے چپوؤں کی بجائے زیادہ تر پانی کی لہروں کے سہارے آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ اور کوکب سر جھکائے منفعل نگاہوں سے مضطرب لہروں کے ساتھ چاند کی کشمکش کا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ بار بار اُسکے جی میں آتا کہ یہ کتنی بُری بات ہے۔ کہ اتفاقِ وقت نے ایسے شخص کے ساتھ تنہائی کے صبر آزما لمحے گذارنے پر مجبور کیا جس نے جہانگیر کی جوانی اور اُسکے حُسن و جمال کو بیکار ضائع کر دیا اور جسکے لئے اُسکے دل میں بنی نوع انسان میں سب سے زیادہ نفرت و کدورت موجود تھی، کشتی آہستہ آہستہ جا رہی تھی کہ یکایک اُردشیر نے چپو پانی سے کھینچ لئے اور معنی آفریں نگاہوں سے کوکب کے چہرہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسکے اپنے چہرہ پر خوف و ہراس کی علامات موجود تھیں اور اُسکے ہاتھ کانپ رہے تھے بالآخر اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو سینہ میں سنبھال کر نہایت دھیمی آواز میں کہنے لگا "کوکب"۔

اُردشیر کی آواز میں تخاطب سے زیادہ الحاح کا عنصر شامل تھا۔ کوکب ایک

مشتعل مجروح ناگن کی طرح سر اُٹھا کر اُسکی طرف دیکھنے لگی۔ بھویں چڑھی ہوئیں۔ جبیں شکن آمیز اور نگاہوں میں وہ قہر کہ معتوب دیکھنے کی تاب نہ لا سکے۔ وہ اپنے سر سے ڈھلکی ہوئی ساڑھی کو درست کر کے کوئی جواب دئے بغیر اپنی کلائی پر بندھی ہوئی بیش قیمت گھڑی کی طرف دیکھنے لگی۔ اُردشیر کی جہاندیدہ نگاہوں نے ایک پل میں تاڑ لیا کہ اس مجسمۂ وفا کے دل میں کس قسم کے خیالات موجزن تھے۔ صرف چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولا آخر میں نے کیا قصور کیا ہے جو تم مجھے یوں گردن زدنی سمجھ رہی ہو۔ میری نسبت جو کچھ بھی تمہیں بتایا گیا ہے سرتاسر غلط ہے، جب چاہو میں اسکی تصدیق کرانیکو تیار ہوں"۔

مغرب کی جانب سے کسی کسان کے پُرسوز گیتوں کی آواز دریا کی مرطوب ہوا کے ساتھ آرہی تھی جو غالباً اپنے کھیتوں کو گیدڑوں کی بے پناہ لوٹ مار سے بچانے کے لئے پہرہ دے رہا تھا۔ پنجابی گیت کی حلاوت اور اُسکے سروں کے اُتار چڑھاؤ نے کوکب کے مشتعل جذبات میں بہت کچھ سکون پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ سوچنے کے بعد وہ نہایت دھیمے اور شریفانہ انداز میں کہنے لگی "لیکن ڈاکٹر ایسی گفتگو کا کیا فایدہ؟ میں نے تمہاری نسبت کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ مجھے اگر کچھ گلہ ہے تو اپنی قسمت سے ....."

یہ کہکر وہ خاموش ہوگئی لیکن اُسکی ناتمام گفتگو بتا رہی تھی کہ وہ ابھی کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اُس نے اپنی گفتگو سے چند جملے حذف کر دئے تھے۔

"بیشک یہ سب قسمت ہی کے کرشمے ہیں لیکن کوکب شاید تم اس بات سے انکار نہ کرو کہ اپنی تمام تکالیف کیلئے "قسمت" سے زیادہ تم خود ذمہ دار ہو۔ اپنی عمر

کا بہترین حصہ ایک ایسے شخص کی خاطر وقف اندوہ والم کر دینا جو کسی طرح بھی تمہارے لائق نہ تھا۔ کہاں کی دانشمندی ہے؟"

یہ کہکر ڈاکٹر اُردشیر نے چپو پانی کی سطح سے اُٹھا کر کشتی میں رکھ لئے، انکے ساتھی اپنی کشتیاں لئے غالباً ریلوے پُل تک پہنچ چکے تھے اور اُنکی کشتی شاہدرہ کا جنگل بھی طے نہ کر سکتی تھی، کوکب اس بات سے گھبرا رہی تھی کہ آج سے اُنیس برس پیشتر اُردشیر کے ساتھ ذرا سی رواداری اور مروت برتنے کا یہ نتیجہ ہُوا تھا کہ وہ تمام دنیوی عیش و آرام اور زندگی کی جملہ مسرتوں سے محروم کر دی گئی تھی اب پھر جبکہ اتنے طویل عرصہ کے بعد اس صبر آزما انتظار کا خاتمہ قریب تھا اور جہانگیر چند گھنٹوں کے بعد واپس آنیوالا تھا اُسکی شومئی قسمت نے اُسے پھر اُسی بدبخت انسان کے بس میں دیدیا جسکے نام سے وہ کانوں پر ہاتھ رکھتی تھی۔ اُسے سب سے زیادہ یہ فکر لاحق تھی کہ کسی طرح جہانگیر کے آنے سے پیشتر وہ اپنے بنگلہ پر پہنچ جائے اور دنیا کی انگشت نمائی سے بچ جائے چنانچہ اِن تمام باتوں کو مدِ نظر رکھکر وہ لجائی ہُوئی آواز میں بولی "ڈاکٹر صاحب آپ کشتی آگے بڑھائیں۔ ہم لوگ بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس قسم کی گفتگو میں وقت ضائع کرنیکا یہ موقع نہیں برائے خدا میری حالت پر رحم کیجئے میں زخم خوردہ ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

آنسو کوکب کی آنکھوں میں ڈھلک ڈھلک کر اُسکے سفید گالوں پر لڑھک رہے تھے اور یہ بات اُسکے لئے سوہانِ روح بن رہی تھی کہ اُنیس سال کی وفاداری اور نیکی چند گھنٹوں میں تباہ و غارت ہوتی نظر آ رہی تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ شرافت اور لجاجت کے تمام الفاظ اُردشیر کیلئے ناکافی ثابت ہو رہے ہیں تو وہ چلّا کر بولی "اُردشیر بیوقوف نہ بنو کشتی کنارے کی

طرف جارہی ہے ایسا نہ ہو کہ دلدل میں پھنس کر رہ جائے۔ ایسی حالت میں ہم تمام رات یہیں بسر کرنے پر مجبور ہو جائینگے۔"

کشتی اس اثنا میں پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہتی ہوئی بائیں کنارے کی طرف جارہی تھی۔ اُردشیر نے چپو اٹھا کر پانی میں ڈال دئے اور ایک دو ہاتھ لگا کر کہنے لگا "کوکب، تم ناراض ہوتی ہو مجھے معاف کرنا مگر میں یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر اسی طرح غصہ اور حسد کے تاثرات سے معذور ہو کر تم کسی عورت کو ہلاک کر دیتیں تو کیا تم باور کر سکتی ہو کہ جہانگیر تمہاری طرح اپنی زندگی کی عزیز ترین گھڑیاں، اف اتنے طویل سال زندان خانہ کی چار دیواری کے باہر تمہارے انتظار کیلئے وقف کر دیتا۔ ناممکن۔ ناممکن۔ پھر جب ایسا نہیں ہے اور یقیناً ایسا نہ ہوتا تو کیا ایسی حالت میں تم اُسے وفادار کہہ سکتی ہو اور اب بھی کہ اُسکی رہائی میں کامل ایک سال باقی ہے کیا تم اس بات پر غور کرو گی کہ عمر کے بقیہ ایام لطف و مسرت میں بسر کرنیکے لئے اُسکی روح فرسا یاد کو دل سے ہمیشہ کیلئے محو کر دو ..... اور ..... اور ..... بالخصوص ایسی حالت میں کہ ایک شخص جہانگیر کی طرح مجبوری سے نہیں بلکہ اپنی خواہش سے اور تمہاری وفاداری و محبت پرستی کے جذبات سے متاثر ہو کر اتنے سال تک تمہارا طلبگار رہا ہے اور اب بھی تمہاری نگاہِ بہار آفرین کا اُمیدوار ہے"

کوکب سخت پریشان خاطر اور گھبرائی ہوئی تھی جب اُس نے غیر متوقع طور پر گفتگو کا رُخ ایسے مبحث کی طرف پلٹتے دیکھا جس سے وہ عمداً گریز کرنا چاہتی تھی۔ اُردشیر کی نسبت اُسے معلوم تھا کہ کچھ ضدی طبیعت کا آدمی ہے۔ اور اس خیال سے کہ وہ کشتی کو بالکل نہ روک لے اُس نے ہلکی اور شرمائی ہوئی آواز میں جواب دیا "ڈاکٹر میں تمہارے ایثار کی قدر کرتی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے

کہ مجھے جہانگیر سے کتنی محبت ہے اور محض اس لئے کہ وہ مجھے سچے دل سے چاہتا تھا۔ سب لڑکوں سے زیادہ وفادار تھا جو مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے اور شاید ..... شاید ..... اسی وجہ سے میں اتنا عرصہ ..... "

ممکن ہے ایسا ہو" اردشیر نے بات کاٹ کر جواب دیا "لیکن میں اسے باور کرنیکے لئے تیار نہیں، اگر فی الحقیقت ایسا ہوتا تو وہ کبھی تمہارے کیریکٹر پر شبہ کرکے ایسی وحشیانہ حرکت کا مرتکب نہ ہوتا۔ یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ اُسے نہ تو تم سے محبت تھی نہ تم پر اُسے کسی قسم کا اعتبار تھا۔ تم خود ہی کہو کہ اُس روز میرے ساتھ ٹھیٹر جانیکے باعث تمہاری پاکبازی میں اُسے شک کرنیکا کیا اختیار حاصل تھا؟"

"خیر" کوکب نے حوصلہ مندانہ انداز سے جواب دیا "میں اس بات کے متعلق تمہارے ساتھ بحث نہیں چاہتی، آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے میں جہانگیر کو تم سے بہتر جانتی ہوں، تم میری خاطر اسے ایک تجربہ خیال کرو۔ ممکن ہے آنے والی نسلیں میری اس "وفاداری" سے کچھ سبق حاصل کرسکیں"

ایک تبسم استہزا اردشیر کے لبوں پر نمودار ہوا۔ محبت، وفاداری کے سچے الفاظ سن کر اسکی خوابیدہ حسیات روح بیدار ہو چکی تھیں لیکن اپنی بات پر اڑے رہنے کی خاطر وہ ذرا بلند آواز میں کہنے لگا "اگر آدمی آدمی میں فرق ہے تو عورت عورت میں بھی فرق ہونا چاہیئے۔ کیا تم اس بات کو محسوس نہیں کرتیں کہ صرف ایک ہی تجربہ کی خاطر اپنی عزیز زندگی کا بہترین حصہ تلف کردینا کتنی بڑی قیمت ہے؟"

یہ سنتے ہی کوکب کے بدن میں کپکپی پیدا ہونے لگی۔ اردشیر کے الفاظ کتنے

بامعنی تھے، انیس سال کے صبر آزما مصائب و آلام کا نقشہ اُسکی آنکھوں کے سامنے متحرک تصاویر کی طرح پھر گیا اور ان مصائب کے دلدوز منظر نے اُسکے بدن کے رونگٹے کھڑے کر دئے۔ "لیکن ان باتوں کو یاد کرنیکا اب کیا فائدہ؟" اُس نے اپنے دل میں کہا "گذرے ہوئے مصائب کو اُس وقت یاد کرنا جب اُنکے اختتام پر صبحِ مسرت کا طلوع ہو، کتنی حماقت اور غیر مآل اندیشی ہے"۔ یہ کہکر اُس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا تو ایک بج چکا تھا اور کشتی کا خرام آبی اب بھی بائیں کنارے کی طرف تھا۔ ریت اور کیچڑ میں دھنسے ہوئے شہتوت کے درخت ہلکی چاندنی اور سایہ میں نہایت ڈراؤنے معلوم ہو رہے تھے۔ کوکب یہ دیکھ کر کہ کشتی چند لمحوں میں ریت کے ایک چھوٹے سے ٹیلے کے ساتھ ٹکرا کر پایاب پانی میں دھنس جانے والی ہے۔ ذرا ترش روئی سے اُردشیر کو مخاطب کر کے کہنے لگی "اس دلی ہمدردی کا شکریہ، لیکن آپ ذرا کشتی کی طرف متوجہ ہو جئے ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ جان بوجھ کر ساتھیوں سے الگ رہنا آپ کے لئے باعثِ افتخار نہیں ہو سکتا"۔

اُردشیر نے کوکب کے چبھتے ہوئے الفاظ کا مفہوم سمجھ کر منفعل نگاہوں سے اُسکی طرف دیکھا پھر چپو پانی میں ڈال کر کشتی چلانے لگا۔ ایک ہاتھ، دوسرا تیسرا۔ اور کشتی گھسک کی سی آواز کے ساتھ ریت سے چمٹ کر رہ گئی۔ اُردشیر نے اپنی انتہائی طاقت صرف کر دی لیکن بے سود۔ کشتی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس جدوجہد میں کافی سے زیادہ وقت گذر گیا اور کوکب پر حبسِ نفس کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اُسکا تخیل بار بار جہانگیر کی تصویر اُسکی نظروں کے سامنے لا رہا تھا جو پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس عالیشان بنگلہ کے برآمدے میں سر جھکائے اُسکا انتظار کر رہا ہوگا اور اُس کا دل لرز رہا تھا اس خیال سے کہ جب اُسے

یہ معلوم ہو گیا کہ کوکب اُردشیر کے ساتھ رات بھر غائب رہی تو خدا معلوم اُسکا جوشِ جنوں کیا رنگ لائے۔ یکایک اپنے خیالات کی اُلجھن سے آزاد ہو کر اُس نے مردانہ ثبات و استقلال کے ساتھ کہا "لاؤ، ایک چپو مجھے دو میں بھی کوشش کروں"۔

لیکن بے سود۔ ہر تدبیر ناکام ثابت ہوئی بالآخر کوکب نے گھبرا کر کہا "اپنے ساتھیوں کو مدد کے لئے پکارو ممکن ہے کہ تمہاری آواز اُن تک پہنچ جائے،

اُردشیر نے اُسکے حکم کی تعمیل میں زور زور سے چلا کر آوازیں دیں، لیکن صدائے بازگشت کے علاوہ اور کوئی آواز نہ تھی حتیٰ کہ پچھلی رات کی خنک ہوا نے بھوکے گیدڑوں کو بھی تھپکیاں دے دے کر نرم گھاس کے بچھونوں پر سلا دیا تھا۔ دونوں کے پیشِ نظر کشتی کی رہائی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اُردشیر پانی میں کھڑا ہانپ رہا تھا اور انہیں یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کتنی دیر سے اس جد وجہد میں مصروف ہیں لیکن اس عرصہ میں چاند اپنی طویل مسافت طے کر کے کامران کی بارہ دری کے پیچھے کھجور کے گنجان درختوں کی اوٹ سے تبسم ریز لب کے ساتھ انہیں جھانک رہا تھا۔ دریا کے لاتعداد مچھر منہ، ہاتھ اور پاؤں کو کاٹ کاٹ کر اُنکا حلیہ بگاڑ رہے تھے اور سُست رفتار دریا ایک تالاب کی طرح ساکت و جامد معلوم ہوتا تھا۔

کوکب نے گھبرا کر گھڑی کی طرف دیکھا تو تین بج چکے تھے اور اُسکے بدن پر رعشہ طاری تھا۔ بدن سرد، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسکے خون میں حرارتِ غریزی بالکل ختم ہو چکی تھی۔ وہ حیران ہو ہو کر سوچ رہی تھی کہ کیا تمام دُنیا کے مصائب و آلام اُسی کے لئے وقف ہو چکے تھے۔ ڈر، پریشانی اور تکان نے اُسے بے دم کر رکھا تھا، یکایک اُردشیر کی سعی اور ایک موافق لہر کی مدد سے کشتی رہا ہو گئی، اُردشیر نے خوشی کا نعرہ لگایا اور اُسے اپنی انتہائی قوت سے کھینچتا ہوا منجدھار میں لے آیا۔ کوکب کی آنکھوں میں مسرت و اطمینان کے آنسو جمع ہو رہے تھے،

جنہیں وہ ایک رومال میں جذب کر کے گھڑی کی طرف دیکھنے لگی تین بج کر پچیس منٹ اور کشتی ابھی پل سے اوپر دھوبی گھاٹ کے قریب تھی اُسے اب بھی اُمید تھی کہ شاید وہ جہانگیر کے آنے سے پیشتر گھر پہنچ جائے لیکن اُسکا دل ڈوب رہا تھا۔ جب تین بج کر پچاس منٹ پر وہ کشتیوں کے مقامِ اتصال پر پہنچے ٭

ہر چہار طرف ہُو کا عالم تھا البتہ ملاحوں کے دو چار کُتے نو واردوں کو دیکھ کر بھونک رہے تھے۔ اُردشیر نے کشتی ملاح کے سپرد کی پھر اُسے مخاطب کر کے کہنے لگا "کیوں علی بخش اس وقت یہاں کوئی گاڑی مل سکتی ہے"

علی بخش نے ایک جمائی لیکر کشتی کو باندھ دیا پھر اُردشیر اور کوکب کی طرف غیر مطمئن نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگا "نہیں صاحب اس وقت تو نہیں البتہ آدھ گھنٹہ تک بہت گاڑیاں آ جائینگی"

یہ جواب سُنتے ہی کوکب پیدل جانیکے لئے تیار ہو گئی لیکن اُس کا ایک ایک قدم من من بھر کا وزنی معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت وہ بالکل چپ چاپ تیزی سے قدم اُٹھائے راوی پارک کو عبور کر رہے تھے۔ قریب چوتھائی میل کی مسافت طے کرنے کے بعد گئوشالہ کے احاطہ کے قریب اُنہیں متعدد گاڑیاں مل گئیں چنانچہ ایک ٹانگہ میں سوار ہو کر وہ گھر کی طرف چلدیئے اور کوکب تمام راہ یہ سوچتی گئی کہ اس غیر متوقع غیر حاضری کے متعلق اپ اقعین اور جہانگیر کو وہ کیا بیان دے سکیگی۔ بار بار کے سوچنے سے اُسکا دماغ پراگندہ ہو چکا تھا اور وہ کسی تسلی بخش نتیجہ پر پہنچنے سے یکسر محروم تھی ٭

ابھی کوکب اور اُردشیر کا ٹانگہ سیٹھ بومن کی مشہور کوٹھی "چاندنی" دو سو گز کے فاصلہ پر تھا کہ کوکب کے توہماتِ باطلہ نے مختلف قسم کے ڈراؤنے منظر

سکے سامنے پیش کرنے شروع کر دئے۔ بشمش جہت پر خاموشی ہی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور تمام بنگلوں پر ایک قسم کا سکون طاری تھا لیکن کوکب کے دل میں خوف و ہراس بدنامی اور رسوائی کے جذبات متلاطم تھے۔ تانگہ جب بنگلے کے آہنیں پھاٹک کو عبور کر کے اندر پہنچا تو چاند کی آخری شعاعوں کے دھندلکے میں کسی متحرک سایہ کے خیال نے کوکب کی رگوں میں خونِ حیات کو منجمد کر دیا۔ اور دوسرے لمحہ میں ایک کرخت آواز نے چلا کر کہا "کون آتا ہے"؟

"میں ہوں سیتل داس" کوکب نے دبی آواز میں جواب دیا پھر تانگہ سے اتر کر بنگلے کی سیڑھیوں پر کھڑی ہوگئی اور خاموشی کے ساتھ سر جھکائے ارد گرد کے گملوں کی طرف بے معنی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اردشیر کے لبوں سے "خدا حافظ" نکلا اور صرف دو منٹ بعد اسکا تانگہ ایک موڑ مڑ کر کوکب کی نظروں سے غائب ہوگیا لیکن وہ اپنے خیالات اور پریشان تصورات میں غرق دس منٹ کے قریب حیران کھڑی رہی۔ اس سے چند قدم کے فاصلہ پر بوڑھا چوکیدار اپنے مضبوط لٹھ پر دونوں ہاتھ رکھے بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

"ایک صاحب کوئی دو بجے سے آپکی راہ تک رہے ہیں" سیتل داس کے منہ سے نکلا اور وہ چند قدم آگے بڑھ آیا۔

یہ سنتے ہی کوکب کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے برانڈے کی چھت اس پر گر پڑی ہو۔ وہ عورت جو عمر عزیز کا ایک حصہ مصائب و آلام میں بسر کر کے پتھر کا کلیجہ بنا چکی تھی ایک تصورِ موہوم سے یوں کانپ رہی تھی جس طرح نسیم سحر کے خوشگوار جھونکے بلند قامت شاہ بلوط کی ٹہنیوں میں ایک ارتعاش مستقل پیدا کر دیتے ہیں۔ خوف و ہراس نے اسکے پاؤں زمین میں گاڑ رکھے تھے اور وہ جہانگیر کے سامنے، جسکے فراق میں دن رات کی گھڑیاں گنی جاتی تھیں، اکیلے

جاتی ہوئی گھبراتی تھی، اُسکا دماغ ملاقات کے رسمی الفاظ تک سوچنے سے معذور اور دل زخمی کبوتر کی طرح پھڑک رہا تھا۔ یہی بنگلہ جس میں کل تک فیروزہ کے ترنم ریز قہقہے گونجتے تھے اور جس کی موجودگی میں ہر چیز حسین معلوم ہوتی تھی، صبح صادق کے نور میں ملبوس اپنے گہرے سکون اور انتہائی خاموشی کی وجہ سے ایک غیر آباد مقدس مقام معلوم ہوتا تھا اور کوکب اُسکی سیڑھیوں پر یوں کھڑی تھی جیسے سفید کپڑے کا احرام باندھے کوئی حسین زائرہ اپنے جذبات نیاز لیکر عشق کے دیوتا کے حضور حاضر ہوئی ہو۔ اتنے میں مشرق کی جانب سے ایک دلایتی مُرغ نے اپنے سفید پروں کو جنبش دیکر اور غرور و نخوت سے گردن بلند کر کے طلوع سحر کا اعلان کیا اور اُسکی متعدد پے در پے آوازیں کوکب کو ورطۂ خیالات سے باہر کھینچ لانے میں ممد ثابت ہوئیں، اس بات کا احساس ہونیکے بعد کہ وہ کہاں کھڑی تھی کوکب نے بوڑھے چوکیدار سے متعدد سوالات کئے اور یہ معلوم کر کے کہ اُس کا بھرہ اور خادمہ دو دفعہ سیٹھ جمشید کے گھر سے جہاں فیروزہ بیاہی گئی تھی، اُس کا پتہ پوچھ آئے تھے اور جہانگیر کو یہانتک معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ڈاکٹر اُردشیر کے ساتھ پیچھے رہ گئی تھی تو اُسکے بدن کا تمام خون خشک ہو گیا اور وہ بیدم ہو کر وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

اِتنے عرصہ میں کوکب کے سارے ملازم بیدار ہو کر اپنے اپنے کام میں لگ چکے تھے اور بنگلے کی مختلف اطراف سے مانوس آوازیں اُسکے کانوں میں آرہی تھیں، یکایک ایک بغلی دروازہ کھلا اور ایک نوجوان خادمہ نے جھک کر اپنی مالکہ کو سلام کیا۔ خادمہ کی آواز سُنتے ہی وہ سیڑھیوں سے اُٹھ بیٹھی اور جھکی ہوئی نگاہوں سے اُسکی طرف دیکھ کر کہنے لگی "دیکھو صابری جو صاحب باہر سے آئے ہوئے ہیں اُنہیں گول کمرہ میں لے آؤ اور ناشتہ کا فوراً انتظام کرو"

یہ کہکر وہ اپنے سونے کے کمرہ میں چلی گئی اور منہ ہاتھ دھوکر ایک بنفشئی رنگ کی ساڑھی زیب تن کی کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ جہانگیر کو یہ رنگ بہت پسند تھا اور غالباً گذشتہ اُنیس برس میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ اس رنگ کی ساڑھی پہن رہی تھی منہ ہاتھ دھوکر وہ ایک قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوکر یہ دیکھنے لگی کہ جہانگیر کی اس طویل غیر حاضری نے اُسکے چہرہ کے خدوخال میں کیا نمایاں فرق پیدا کر دیا تھا۔ اگرچہ آئینہ اس عرصہ کے تمام تغیرات بے کم و کاست اُسے بتا رہا تھا مگر خود کوکب یہ محسوس کر رہی تھی کہ عمر کے انتالیسویں سال میں بھی وہ بوڑھی نہ تھی بلکہ اُسکا دل بدستور جوان تھا۔ وہ جلدی جلدی گول کمرہ میں آکر بیٹھ گئی۔ اور ایک منٹ بعد اُس نے ملحقہ کمرہ سے کسی شخص کے آہستہ آہستہ چلنے کی آواز سُنی اور اُس کا دل دھک سے رہ گیا ۔

دوسرے لمحہ میں کسی شخص نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور آن کی آن میں کوکب کا نرم و نازک ہاتھ نووارد کی مضبوط گرفت میں تھا اور وہ اسکی گفتگو کو یوں سُن رہی تھی جیسے گہری نیند میں کوئی آواز سنائی دیتی ہے اور خود کو ایک نئی دُنیا ایک نئے قالب میں تصور کر رہی تھی "میرا تار آپکو مل گیا ہوگا"، جہانگیر کے منہ سے نکلا "دراصل مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے ۲ کی بجائے چار بجے کا وقت لکھدیا تھا" الفاظ اُسکے مُنہ سے اٹک اٹک کر نکل رہے تھے۔ کوکب اُسے دیکھ دیکھ کر گھبرا رہی تھی اور چاہتی تھی کہ ایک چیخ مار کر بھاگ جائے "آہ! آہ!!" اُس نے اپنے دل میں کہا اُس شخص کے لئے میں نے اپنی جوانی برباد کی تھی جو کسی قسم کی بھی مردانہ صفات سے متصف نہ تھا ۔

جہانگیر خلافِ توقع نئے لباس میں ملبوس مؤدبانہ انداز سے اُسکے سامنے کھڑا تھا اور اس طرح جیسے کوئی ادنےٰ درجہ کا آدمی ہو۔ کوکب اس وقت محسوس

کر رہی تھی کہ شیشہ کا وہ گلوبند جس میں وہ انیس برس سے قید تنہائی کے ایام کاٹ رہی تھی، ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہے۔ یوں تو وہ عرصہ سے یہ تصور کئے بیٹھی تھی کہ جہانگیر اپنی واپسی پر ایک بوڑھا، بدشکل، بگڑے قسمت اور مظلوم صورت بن کر آئیگا مگر اسکے ذہن تک یہ بات کبھی نہ آئی تھی کہ اسکے ساتھ ہی نجابت و شرافت کے جائز اور صحیح غرور سے بھی تہی داماں ہوگا۔ یہ جیل خانہ کی زندگی کے تاثرات تھے اور اس سے بڑھ کر شراب گلفام کے، اس آتش سیال کے نتائج تھے جو عشق و محبت کی آگ سے بھی زیادہ تیزی سے انسان کے دل و دماغ کو جلا کر بیکار کر دیتی ہے۔

کوکب نے اپنے ہاتھ سے اسکے لئے ایک کرسی کھینچ دی اور لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگی "جہانگیر بیٹھ جاؤ۔ سفر کی دوری اور کوفت نے تمہیں مضمحل بنا رکھا ہے" ان الفاظ کے ساتھ وہ خود بھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ محبت کا وہ پرارمان خواب جس کی تعبیر کے انتظار میں ایک ایک دن اور دن کا ایک ایک گھنٹہ گنا جاتا تھا، پریشان ثابت ہوا اور تعبیر سے پہلے سطح آب پر تیرنے والے حباب کے مانند تحلیل ہو کر رہ گیا۔ اتنے میں ایک ملازم نے نہایت خوبصورت اور چمکدار برتنوں میں صبح کا ناشتہ لاکر میز پر رکھ دیا۔ کوکب نے چائے کی ایک لذیذ پیالی تیار کر کے جہانگیر کے سامنے رکھی اور کیک کے چند ٹکڑے کاٹ کر اسکی طشتری میں ڈال دیئے اور یہ دیکھ کر حیران ہو گئی کہ اسکا وہ بے نیاز محبوب جو چائے اور مٹھائی کو بچوں کا دل بہلاوا کہا کرتا تھا آج "رغبت" سے نہیں بلکہ بہیمانہ خواہش سے کھا رہا تھا۔

اس عرصہ میں کوکب محسوس کرنے لگی کہ لحظہ بلحظہ جہانگیر کی محبت اسکے دل میں نفرت و حقارت سے تبدیل ہو رہی ہے۔ اس نے متعدد بار خود کو نفرین

کبھی کہ کیا وہ اس شخص پر جان نہ چھڑکتی تھی۔ کیا اُس نے اتنے سال تک وفاداری اور نیک نیتی سے اُس کا انتظار نہیں کیا؟ یہ سوال وہ اپنے دل سے کر رہی تھی اور حیران تھی کہ اسکا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ بیس سال کی وفاداری کس کے لئے؟ اُس انسان نما ہستی کیلئے جسکی شکل سے وحشت، آنکھوں سے پریشانی، حرکات سے گنوارپن اور طرزِ تکلم سے اجنبیت برستی تھی لیکن اُسکے پاس ایک جواب تھا کہ وہ "وفادار" تھی اور اُس وفاداری کی حامل تھی جو قسامِ ازل نے عورت ہی کیلئے مخصوص رکھی ہے۔

جہانگیر ابھی تک کھانے میں مشغول تھا۔ کوکب چونکہ زیادہ سویرے کھانیکی عادی نہ تھی اس لئے بجائے کھانے کے وہ زیادہ تر کھلانے میں مصروف تھی اور رحم بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی لیکن یہ ترحم ایک عاشق کا جذبہ نہ تھا بلکہ ایک دردمند انسان کا جس کا دل کسی مصیبت زدہ کو دیکھ کر پسیج جائے اگرچہ کوکب کی برق حسن کی حیات افروز تجلیاں آخری راتوں کے بے نور چاند کی طرح ماند ہو چکی تھیں مگر اُسکے حسن کی کشش جاذبیت اس حد تک فنا نہ ہوئی تھی۔ جتنا انقلاب عظیم کہ انیس سال کے طویل عرصہ نے جہانگیر کی دلربا صورت میں پیدا کر دیا تھا۔ اس وقت جہانگیر کچھ کھوئی ہوئی لیکن تشکر آمیز نگاہوں سے کوکب کے سفید چہرہ کی طرف دیکھ رہا تھا اور اُسکے کرخت ہاتھ جن میں موٹی موٹی رگیں بٹی ہوئی رسّیوں کی طرح اُبھر رہی تھیں، چائے کی پیالی ابھی تک تھامے ہوئے تھے۔ آہ! کوکب نے لمبی سانس لیکر اپنے دل میں سوچا، ان ہاتھوں کی خوبصورت اور مردانہ بناوٹ پر وہ کس قدر مغرور تھی اور اُسکا دل بھر آیا۔ جب انیس ۱۹ سال پہلے کا نقشہ اُسکی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ جس وقت چیفکورٹ کے باہر انہیں خوبصورت ہاتھوں کو بوسہ دے کر اُس نے "خدا حافظ" کہا تھا "میں کچھ دیر باغ میں بیٹھنا چاہتا ہوں۔ شاید موتیا کے پھول اب کھل

رہے ہوں تمہیں یاد ہے میں انہیں بہت پسند کرتا تھا" یہ کہکر وہ شرمائی ہوئی نگاہوں سے کوکب کی سڈول کلائی کی طرف دیکھنے لگا لیکن اس وقت تک وہ ایک عاشق کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مہمان اور اس سے بھی زیادہ صحیح الفاظ میں ایک محکوم کی طرح کوکب کو مخاطب کر رہا تھا "اُف! اس شخص کے ساتھ کیسے نباہ ہوگا" کوکب نے دل میں سوچا اور وہ اپنی ساڑھی سنبھال کر اُٹھ کھڑی ہوئی پھر ہال کا دروازہ کھول کر اُس نے صابری کو آواز دی پھر جہانگیر کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگی "تم باغ کی سیر کرو میں بھی تھوڑی دیر میں تمہارے پاس آؤنگی، شاید تم اُن لوگوں کی نسبت کچھ سُننا پسند کرو جنہیں تم جانتے ہو۔ اس میں تمہارے لئے دلچسپی کا سامان ہوگا"

اِتنے میں صابری کمرہ کے اندر داخل ہوئی اور کوکب نے ضروری ہدایات دے کر اُسے جہانگیر کے ساتھ کر دیا اور خود اپنی خوابگاہ میں داخل ہو کر ایک آرام کرسی پر گر پڑی "بس یہ تھی ساری تمنا اور آرزو"، کوکب کے مُنہ سے نکلا اور گرم گرم آنسوؤں کی رو اُسکی آنکھوں سے بہہ نکلی، اُس نے نگاہ اُٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا، باغ کی خوبصورت روشیں اور اُنکو سیراب کرنے والی چھوٹی سی آبجو گلاب اور موتیا کے حسین رنگین پھول سورج کی ہلکی اور تمازت سے معرا کرنوں میں چمک رہے تھے۔ آم کے طوبے قامت درختوں پر پرندوں کے چہچہے اُسے اور زیادہ پامال کر رہے تھے۔

"خیر کوئی مضائقہ نہیں" کچھ دیر سوچنے کے بعد بیساختہ اُسکے مُنہ سے نکلا "میری جوانی میں کبھی تو انحطاط پیدا ہو چکا ہے۔ وہ کچھ عرصہ میرے ساتھ رہنے کے بعد بالکل درست ہو جائیگا" یہ کہکر اُس نے آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے اور ایکبار پھر آئینہ کی طرف دیکھنے لگی، اب اُسے محسوس

ہونے لگا کہ اُس کی پژمردہ رُوح کسی عطر بیز پھول کی طرح کھل رہی ہے۔ اور اُنیس برس کے بعد اُس نے ایک جوان عورت کی طرح انگڑائی لی بالآخر آج خوشی و مسرت کا دن تھا کیونکہ وہ قیدِ تنہائی سے رہائی پا چکی تھی اور مسرور تھی اس بات سے کہ اُسے اب کبھی بڑے گلوب کے نیچے سے نہ رینگنا پڑیگا جس سے ابھی ابھی اُس نے نجات حاصل کی تھی۔ عورت، دنیا کی محبوب ترین شے کتنی قناعت پسند ہے بشرطیکہ وہ قناعت پسند بننا چاہے۔

اب وہ دُنیا کو متبسم نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جوانی اور چہرے کی پھول جیسی رنگت کے سوا اُسکے پاس سب کچھ تھا مٹی ہوئی حیاتِ شباب دوبارہ انگڑائیاں لے رہی تھی۔ اور وہ محسوس کر رہی تھی کہ یا تو آج ہی پیدا ہوئی ہے یا کسی گہری نیند سے سو کر اُٹھی ہے، وہ فانی دُنیا جسکی کوئی دلچسپی اُسکے لئے کسی قسم کی جاذبیت اپنے اندر پنہاں نہ رکھتی تھی اب اُسکی ہر چیز میں انجذابِ فطری موجود تھا۔ اُس کی فضا نکہت بیز، اُسکی خاک کے ذرات سونے اور ہاتھی دانت کی طرح درخشاں اور اُس کا اُفق طلوعِ سحر کی سُرخی میں رنگین نظر آ رہا تھا۔ اب وہ آزاد تھی مسرور و شادماں!!

"بائی جی۔ بائی جی" صابری نے دروازہ پر دستک دی۔ لیکن اُسکی بھرائی ہوئی آواز میں سوگوار اضطراب موجود تھا۔ کوکب گھبرا کر اُٹھ بیٹھی۔ اور دروازہ میں کھڑی ہو کر پوچھنے لگی "کیا ہے صابری۔ ہیں تم رو رہی ہو۔ کیا بات ہے؟"

صابری اپنے دوپٹہ سے آنسو پونچھ کر کہنے لگی "سیٹھ صاحب کو خدا معلوم کیا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مر گئے ہیں۔ مگر ابھی کوئی کوئی سانس باقی ہے"

کوکب بدحواس ہو کر باغ کی طرف دوڑی گئی اور ایک چوبی بنچ پر

اُس نے جہانگیر کو از خود رفتہ اور بےحس و حرکت لیٹے دیکھا۔ اُس کا تنفس نہایت تیز تھا اور کھُلی ہوئی آنکھیں آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔ کوکب نے معاملہ کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے بوڑھے مالی کی طرف دیکھ کر کہا ڈاکٹر۔ ڈاکٹر۔ فوراً ڈاکٹر کو لاؤ۔ اور خود اُسکے کوٹ اور تنگ واسکٹ کے بٹن کھول دیئے اور حیرت زدہ ہو کر سوچنے لگی کہ اُس کے دل کی کلی جو چند منٹ گذرے کھل چکی تھی اب پھر مُردہ ہو کر شاخِ مسرت سے گر جانے والی ہے۔ اتنے میں ڈاکٹر پہنچ گیا اور مریض کو دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ لیکن کوکب کے دل پر جو گذر رہی تھی اُس کا پُرسانِ حال کوئی نہ تھا۔

"بائی جی صاحبہ" نے بادیدۂ نم روتی صورت بنا کر کہا "سیٹھ صاحب مجھ سے پُوچھ رہے تھے کہ بائی جی ڈاکٹر اور دلشیر کے ساتھ ہر روز سیر کے لئے جایا کرتی تھیں یا کبھی کبھی اور میں جواب بھی دینے نہ پائی تھی کہ انکی یہ حالت ہو گئی"

لیکن وہ بُت کی طرح کھڑی تھی ساکت و جامد اور دل ہی دل میں کہہ رہی تھی کہ اتنی طویل زندگی میں بس یہی ایک آزادی و فرصت کا لمحہ قسامِ ازل نے اُسکی قسمت میں لکھا تھا اور وہ بھی شکوک سے لبریز۔ وہ چیخ مار کر رونا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر اور ملازمین کی موجودگی کا اُسے احساس پیدا ہو گیا اور وہ ایک لمبا سانس لیکر طوفانِ جذبات کو سینے میں سمیٹ کر رہ گئی۔ اُنتالیس سال کی پاکیزہ زندگی معصیت و عصیاں سے محفوظ۔ آہ کس امید پر وہ جذباتِ شباب اور گناہ کی ترغیبات پر ہمیشہ غالب آتی رہی۔ اسی دن کے لئے۔ اسی ساعت کیلئے اُس کا دل پھٹا جاتا تھا اور مہیب آوازوں کے ساتھ تمام درخت اُسے اپنے چاروں طرف گھومتے نظر آتے تھے۔

"یہ فالج کی بیماری ہے۔ اگر کوئی چیز اس شخص کو زندہ رکھ سکتی ہے۔ تو

مس بومن وہ آپ کی غیر متزلزل وفاداری ہے اور بس" اُسکا پڑوسی ڈاکٹر مقبول احمد یہ الفاظ کہہ رہا تھا جو اس عدیم النظیر معاشقہ کی پُردرد کہانیاں اُس وقت بھی سُنا کرتا تھا جبکہ وہ ابھی اسکول کا ایک معمولی طالب علم تھا۔

کوکب نے ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر آنسو بھری آنکھیں جُھکالیں گویا اثبات میں جواب دے رہی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی محسوس کرنے لگی کہ شیشہ کا وہ بڑا ڈھکنا جس کی قید سے چند منٹ پیشتر آزاد ہُوئی تھی اب ساری بقیہ عُمر کے لئے اُس پر رکھ دیا گیا تھا۔

(جزواً ماخوذ) (ہمایوں)

کنول کی بیٹی

(از جناب سدرشن صاحب)

رات کا وقت تھا۔ چاند کی سفید کرنیں زمین کو اپنی سرد روشنی میں غسل کرا رہی تھیں۔ سدرشن ایک جھیل کے کنارے بیٹھے کسی گہری سوچ میں محو تھے آخر انہوں نے سرد آہ بھری اور کہا:۔

"میرا خیال غلط نکلا۔ انسان دُنیا کی سب سے بہتر اور حسین ہستی نہیں یہ کنول کا پھول جو ہوا کے جھونکوں سے کانپ رہا ہے۔ اُس سے زیادہ نظر فریب اور نگاہوں کو اپنی جانب کشش کرنے والا ہے۔ اُس کی پنکھڑیاں کیسی پیاری ہیں؟ اُس کا رنگ کیسا دل آویز ہے؟ اُس کی شکل و صورت کیسی نظر نواز ہے؟"

"مقابلے کے میدان میں بے جان پھول دُنیا کی سب سے حسین نازنین کو شکست دے سکتا ہے۔ بلکہ اگر دُنیا کی تمام خوبصورتی ایک جگہ جمع کر دی جائے۔ تب بھی اُس میں وہ شان پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو اس اکیلے پھول کی رعنائی میں سمائی ہوئی ہے"

"میں چاہتا ہوں۔ کہ اس قسم کی لڑکی پیدا کروں۔ جو انسانوں میں ایسی ہو جیسی پھولوں میں کنول۔ جس سے دُنیا کے تاریک کونے جگمگا اُٹھیں اور جسکے سامنے شیاما کے زمزمے بھی ماند پڑ جائیں"

سری کرشن نے چند منٹ سکوت کیا۔ اور پھر اپنی سانولی انگلی اٹھا کر کہا "اے کنول کے بے جان پھول! ایک جاندار دوشیزہ کی صورت میں بدل جا۔ اور میرے سامنے کھڑی ہو"

پانی کی لہروں نے اپنے آپ کو کناروں کے ساتھ ٹکرایا۔ رات زیادہ خوبصورت ہوگئی۔ چاند نے اپنی کرنوں کو زیادہ روشن کیا۔ تالاب کا پانی چمکنے لگا۔ گویا چاند کی روشنی اس میں حل ہوگئی۔ سوتی ہوئی چڑیاں اپنی روح کی پوری قوت سے نغمہ زن ہوئیں۔ اور تھوڑی دیر کے بعد دفعتہً خاموش ہوگئیں۔ کنول کا پھول ٹہنی سے علیحدہ ہوکر پانی میں غوطہ زن ہوا۔ اور اس کے بعد ایک حسین مرجبین اپنے پنکھڑیوں کے مانند نرم و نازک کپڑوں کو نچوڑتی ہوئی تالاب سے باہر نکلی۔ حسین قدرت میں زندگی آگئی تھی۔

سری کرشن نے بادۂ مسرت سے جھومتے ہوئے کہا "پہلے تم تالاب کا پھول تھیں بیکار اور بیحس و حرکت۔ مگر اب تم میرے خیال کا پھول ہو۔ زندۂ رقصاں۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ تم مجھ سے باتیں کرو"

لڑکی نے سر جھکا کر آہستگی سے بولنا شروع کیا "ہوا میں خوشبو بھر گئی مہاراج میں آپ کے اشارے پر پیدا ہوئی ہوں۔ اس لئے آپ ہی کے اشارے پر چلونگی۔ میں جاننا چاہتی ہوں۔ کہ میرے رہنے کی جگہ کونسی ہے؟"

سری کرشن نے چاند کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھا۔ اور جواب دیا "گلشن"

"مہاراج وہاں ہوا پھولوں کو تھپیڑے لگاتی ہے۔ مجھے اس سے خوف آتا ہے۔ جب میں پھول تھی۔ تو بجلی کی کڑک سے میرے جسم میں رعشہ آجاتا تھا۔ میرے لئے گلشن موزوں نہ ہوگا"

"کیا تم اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں پسند کروگی؟"

"وہاں برف ہے۔ سردی سے میرا دل لرزنے لگتا ہے"

"سمندر کی تہ۔ وہاں میں تمہارے لئے مونگے کا محل بنا دوں گا؟"

"لیکن اُس کی گہرائی دیکھ کر میرا خون رگوں میں منجمد ہو جائیگا"

"اچھا! تو نسان بیابانوں میں رہنا تمہیں مرغوب ہوگا؟"

"وہاں پر آندھیاں جھکڑ اور بجلی کے کڑکے ایک عام بات ہے۔ میرا گزارہ وہاں کیسے ہو سکیگا؟"

سری کرشن نے مسکرا کر پوچھا "تو تمہیں کہاں رکھا جائے۔ کیا ایلورا کے غاروں میں؟"

کنول کی بیٹی کے اعضا میں لرزش پیدا ہوئی۔ اُس نے خوف و ہراس سے آنکھیں بند کر کے جواب دیا "وہاں تاریکی ہے"

"کنول کے پھولوں کے پاس پانی کی سطح پر؟"

"وہاں کا ہی ہے"

سری کرشن نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ اور خاموش ہو گئے۔ اُس وقت اُن کا دل اُداس تھا۔ چہرہ رنجیدہ۔ اُنھوں نے اپنی بانسری نکالی۔ اور اُسے بجانے لگے نغموں کے الاپ سے قدرت ناچنے لگی۔ چاندنی حیرت سے رُک گئی۔ کنول کی بیٹی چُپ چاپ سامنے کھڑی سُن رہی تھی۔

رات گزر گئی۔ سورج کی شعاعیں سطح آب پر رقص کرنے لگیں۔ تالاب کا پانی تاڑ کے پتّے اور درختوں پر رہنے والے پرندے اپنے معصوم خواب ناز سے بیدار ہوئے۔ یکایک سری کرشن نے بانسری ہاتھ سے رکھدی۔ اور کہا "وہ شاعر ہے"

تالاب کے شفاف پانی پر کسی انسان کا عکس دکھائی دیا۔ ہوا میں کسی کی

مست شباب تان گونجی۔ سبز گھاس پر کسی کے قدموں کے چلنے کی مدھم آواز سُنائی دی اور ذرا فاصلے پر ایک نوجوان شخص بینا ہاتھ میں لئے آتا دکھائی دیا۔

شری کرشن نے اُسے دیکھا۔ اور پھر دوبارہ کہا: "وہ شاعر ہے"

شاعر نے کنول کی بیٹی کو دیکھا۔ تو بینا اُس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اُسکے قدم زمین میں گڑ گئے۔ اور اُس کے الفاظ شعریت سے بھرے ہُوئے ہونٹوں پر منجمد ہو گئے۔ سری کرشن نے پھول کو جیتی جاگتی لڑکی میں تبدیل کیا تھا۔ لڑکی کے کمال حُسن نے شاعر کو پتھر کا بُت بنا دیا۔

سری کرشن نے کہا: "کیوں شاعر! تمہارا کیا حال ہے؟"

شاعر نے چونک کر بینا سنبھالی۔ آگے بڑھ کر سری کرشن کے پاؤں پر سر جھکایا۔ اور جواب دیا: "مہاراج! مَیں محبت کرتا ہوں محبت کے گانے بناتا ہوں اور محبت کے پد گاتا ہوں۔ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ محبت کیلئے وقف ہو چکا ہے۔ میں محبت کے سوائے اور کچھ نہیں چاہتا۔ مجھے محبت کا دان دیجئے"

یہ کہتے کہتے شاعر نے کنول کی بیٹی کی طرف پیاسی نگاہوں سے دیکھا اور ایک سرد آہ بھری۔

سری کرشن پر جیسے کوئی خاص عقدہ وا ہو گیا۔ وہ بیٹھے تھے۔ کھڑے ہو گئے۔ اور بولے: "دُنیا میں سب سے خوبصورت لڑکی! مجھے تیرے لئے جگہ مل گئی"

"کہاں؟"

سری کرشن نے جواب دیا: "اس شخص کے دل میں جا کر رہو"

شاعر نے گردن جُھکا دی، اسکے بینا کے تاروں سے جھنکار کی آواز برآمد ہُوئی۔ کنول کی بیٹی ایک ادائے حُسن کے ساتھ آگے بڑھی۔ اور شاعر کے دل میں

داخل ہونے لگی لیکن یکایک پیچھے ہٹ آئی۔ اس وقت اُس کا چہرہ خوف سے برف کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ سری کرشن کو تعجب ہوا۔

"کیا تم وہاں بھی ڈرتی ہو؟"

"مہاراج! آپ نے مجھے کیسی جگہ دی ہے۔ وہاں تو سربلند پہاڑوں کی برفانی چوٹیاں۔ لہروں والے خوفناک سمندر کی گہرائیاں۔ انسان بنوں کی خاموشیاں اور ایلورا کی تاریک گفائیں سب کچھ موجود ہے میں وہاں کیسے رہونگی"

سری کرشن نے جواب دیا۔ "نہ ڈرو۔ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تم خوبصورتی ہو۔ تمہارا گھر شاعر کا دل ہے۔ اگر وہاں برف ہے۔ تو تم سورج کی شعاع بن کر اُسے پگھلا دو۔ اگر وہاں سمندر کی گہرائی ہے تو تم موتی بن کر اُسے غواصوں کے قابل بنا دو۔ اگر وہاں تنہائی ہے۔ تو تم شیاما بن کر وہاں زمزمہ سنجیاں شروع کر دو۔ سناٹا ٹوٹ جائیگا۔ اگر وہاں ایلورا کے تاریک غار ہیں۔ تو تم چراغ بن جاؤ۔ اندھیرا دُور ہو جائیگا"

شاعر نے سر جھکا دیا۔ سری کرشن نے آشیرواد دی۔

کنول کی بیٹی انکار نہ کر سکی۔ وہ اب تک وہیں رہتی ہے[1]

(چندن)

---

[1] پولینڈ کے شہرۂ آفاق قصہ نویس سین کائی وِز کی ایک کہانی کی بنا پر۔

اندھا دیوتا

(از حکیم احمد شجاع صاحب بی۔ اے۔ علیگ)

۱

اسلم لاہور کے ایک مشہور سوداگر کا بیٹا تھا۔ اس کے والد نے اپنے باپ دادا سے کوئی دولت ورثہ میں نہ پائی تھی۔ جو کچھ کمایا اپنے دست و بازو کی ہمت اور دماغ کی ذہانت کی بدولت جو کچھ بچایا اپنی ان تھک کوششوں۔ اور کفایت شعار زندگی کے باعث۔ اسلم کی ماں، جوان عمر میں ہی داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ اسلم ابھی بچہ تھا۔ اس کے والد نے اپنی نیکدل اور حسرت نصیب بیوی کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھنے اور اسکو ایک سوتیلی ماں کی زیادتیوں سے بچانے کے لئے پھر شادی نہ کی۔

اسلم ایم۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد اپنے والد کے منشاء کے مطابق قانون پڑھنے کے لئے لاہور لاء کالج میں داخل ہو گیا۔ پہلے امتحان میں کامیاب ہونیکے بعد ابھی دوسرے سال کی تعلیم شروع ہی کی تھی کہ ابا یکلخت بیمار ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے۔ اسلم کو اپنے والد کی ناگہانی موت سے بے انتہا صدمہ ہوا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اسے بے سر و سامان

چھوڑ کر چل بسے تھے۔ کیونکہ حساب کتاب کی پڑتال کے بعد اس پر اپنے والد کی کفایت شعار زندگی کا نتیجہ کھلا منیب کے پاس کوئی پچھتر ہزار روپیہ کے نقد پونڈ تھے۔ ساڑھے تین لاکھ روپے مختلف بنکوں میں جمع تھے اور پچاس ہزار کی مالیت کی ہنڈیاں تجوری میں محفوظ تھیں۔ شہر میں دو عظیم الشان مکان اور سول لائن میں چھ بنگلے تھے۔ جن کے کرایہ کی آمدنی پونے چار سو روپے ماہوار تھی کل ماہوار آمدنی کا حساب کیا گیا تو ساڑھے بارہ ہزار کا تخمینہ ہوا۔ اسلم کو والد کی موت کا صدمہ اس لئے ہوا۔ کہ اس کا اس دنیا میں اپنے والد کے سوا اور کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ اس کی والدہ ایک غریب گھرانے کی یتیم اور قریباً لاوارث لڑکی تھی۔ اور اس کے والد کے تمام قریبی رشتہ دار یکے بعد دیگرے راہی بقا ہو چکے تھے۔ اب اس بھری دنیا میں وہ باوجود اپنی دولت اور لیاقت کے بالکل اکیلا تھا شکل و صورت۔ وضع و تراش۔ عادات و خیالات کے لحاظ سے اسلم ایک قابلِ رشک انسان تھا۔ جس طرف جاتا لوگوں کی انگلیاں اٹھ جاتیں۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے انگریزی وضع کے کپڑے اس کے ذرا لمبے بال اس کی مستانہ چال میں ایک خاص ادا پیدا کر دیتے تھے اس کے شفاف چہرے پر بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھیں عجیب حسن پیدا کرتی تھیں۔ اگرچہ اس کے لبوں پر ایک غیر فانی مسکراہٹ ہمیشہ ایک کھلے ہوئے چمن کی بہار کا پتہ دیتی تھی۔ مگر اس کشادہ سینے کی تہوں کے نیچے ایک یاس انگیز اور درد رسیدہ دل تھا۔ اسلم دولت و عزت کی سرشاری میں بھی کبھی خوش نہ رہتا تھا۔ اسکے دوست اس سے ملنے آتے۔ وہ ان کی خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ اٹھا رکھتا۔ مگر ہر دوست قریباً قریباً یہی محسوس کرتا چلا جاتا۔ کہ اسلم خوش نہیں۔ آخر اس کے دوستوں میں

خصوصاً اور واقفوں میں عموماً اس بات کا چرچا ہونے لگا۔ کہ میاں اسلم کا دل کسی غیر معلوم غم کے بارِ گراں سے دبا رہتا ہے ——

والد کی موجودگی اسلم کے لئے ایک طلسم تھا۔ جو اِن کی وفات کے ساتھ ہی ٹوٹ گیا۔ تھوڑے دنوں بعد ہی اس نے اپنی زندگی میں ایک خاص کمی محسوس کی۔ اور اس کو اپنا گھر خالی خالی سا نظر آیا۔ نوکر چاکر گاڑی گھوڑا سب کچھ موجود تھا۔ مگر ایسا کوئی نہ تھا جس کو وہ اپنے دل کی باتیں سُناتا یا جس کا خیال اسکو کام کرنیکے وقت یا آرام کی ساعتوں میں بے چین کرتا۔

اسلم فطری طور پر فلسفی مزاج تھا۔ اس پر چار پانچ سال کی فلسفہ کی تعلیم اور دن رات کی محنت نے اس فلسفیت کو ایک خاص روش عمل بخش دی تھی اور وہ بڑی کامیابی سے ہر عقدہ کا حل سوچ لیتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس اضطرار۔ اس اُداسی اور اس کمی کے احساس کا مطالعہ کیا۔ اور اس عقدہ کو حل کرنا چاہا۔

اس نے خیال کیا کہ اسکے لئے ایک محرم راز کی ضرورت ہے۔ جو اسکی خوشی سے خوش ہو۔ اور اس کے غم سے مغموم۔ جو اس کی خوابیدہ طاقتوں کو بیدار کرے۔ اس کے منجمد دل کو محبت کے شعلوں سے نرم کرے اور خود اس محبت کا آئینہ بن کر اسکی زندگی کو ایک حقیقی لُطف سے بہرہ اندوز کرے۔ ظاہر تھا کہ ایک ہمدرد عورت کے سوا اس کے دل میں یہ کیفیتیں کوئی اور ہستی پیدا نہ کرسکتی تھی ..... مگر ..... آہ یہ ایک بہت ٹیڑھا سوال تھا۔ کیا اسلم چار سال سے اس سوال کے بلاخیز گرداب میں غوطے نہیں کھا رہا تھا؟ اس نے کتنی شادیوں کا عبرتناک انجام دیکھا۔ اور ان سے سبق حاصل کیا۔ کتنی کتابیں فلسفۂ ازدواج کے

متعلق پڑھیں۔ اور ان کو آہ سرد بھر بھر کر ختم کیا۔ یہی سوال اسلم کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی دولت۔ اسکا حسن اس کی وجاہت، حسین سے حسین صورت کو ..... خرید سکتی ہے مگر آہ اسے یہ بھی علم تھا کہ یہ تمام دولت، محبت کی ایک جھلک نہیں خرید سکتی۔ وہ حسنِ صورت اور شرافتِ طبعی کو صرف محبت کے زیور سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک حقیقی حسن محبت میں تھا۔ صورت و سیرت کی خوبیاں محبت کے بغیر ایسی تھیں۔ جیسے ایک پتھر کے حسین بت کو آراستہ کر دیا جائے۔ یا ایک مہ جبیں دنیک سیرت عورت کا دل نکال لیا جائے۔

چار سال سے وہ اسی تلاش میں تھا۔ ایک بار بمبئی گیا۔ اور وہاں مختلف عورتوں کے چہروں میں اس محبت کو تلاش کرنا چاہا۔ ہاں۔ محبت کے متعلق اسلم کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ یہ جذبہ بالکل فوری، اضطراری اور بے اختیاری ہے۔ اور ایک نظر میں ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ محبت جو آہستہ آہستہ ترقی کے مدارج طے کرے۔ یا جو صرف اس لئے پیدا ہو جائے کہ ایک انسان کسی کی زندگی کے لئے ضروری اور مفید ہے۔ محبت نہیں پسند ہے۔ لوگ پسند اور محبت میں اسی قدر دھوکا کھاتے ہیں۔ جس قدر دوستی اور محبت میں، یا پرستش اور عزت میں۔

اسی طرح جہاں جہاں وہ جا سکا، گیا۔ جس جس چہرہ تک اس کی رسائی ہو سکتی تھی۔ وہ پہنچا۔ کیونکہ صحبت یا گفتگو کسی چیز سے اسے واسطہ نہ تھا۔ وہ محبت کو پہلی نظر کی تیز شعاعوں میں ڈھونڈتا تھا۔ مگر وہ ہمیشہ اپنے

دل کو اسی کیفیت بار دیں دیکھ کر سر جھکا لیتا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اور پھر وہ ایک گہری اور سرد آہ بھر کر سگرٹ پینے لگ جاتا۔

سگرٹ اس نے اسی دن سے پینا شروع کیا تھا جس دن سے یہ اُمنگ اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ آرزوئے ناکام اپنی حسرت کسی اور داغ ناتمام سے مٹانا چاہتی تھی۔ سگرٹ اس مصروفیت کے لئے بہترین بہانہ تھا۔ اس لئے اب جب کہ اس کے دل کی حسرت پوری ہوتی دکھائی نہ دیتی تھی۔ سگرٹ ہی اس کے دل کا کھلونا نظر آتا تھا۔ وہ اپنا بہت سا وقت سگرٹ پینے میں ہی صرف کرتا تھا کسی خاص نشہ کی مجبوری یا عادت کے تقاضے سے نہیں۔ بلکہ محض اس طرح جیسے ایک بچہ کسی خاص دلکش کھلونے سے کھیلتا ہے۔

اب اس آرزو کے شعلے اسے دن بھر بیقرار رکھتے تھے۔ وہ رات بھر اپنی آئندہ صبح کا دستور العمل تیار کرتا رہتا تھا۔ مگر ہر صبح، اس کی ناکامی کی قبر پر آنسو بہا کر پردۂ عدم میں چھپ جاتی تھی۔

دوست، جن سے اسے کبھی محبت نہ تھی۔ اب اسے بُرے معلوم ہوتے تھے۔ عیش و آرام بغیر ایک شریک کی شرکت کے ڈراؤنا نظر آتا تھا۔ زندگی بے معنی دکھائی دیتی تھی۔ اور وہ اپنی زندگی کی محنت پر آنسو بہاتا تھا۔ آئینہ شاید اس کا سب سے زیادہ مہلک دشمن تھا۔ اس کی صحبت سے وہ حتی المقدور بھاگتا تھا۔

ایک شب اس کا دل سیاہ رات کی طرح بے چراغ تھا۔ اُمید کا ٹمٹماتا ہُوا

دیا ہر روز کی مایوسیوں نے بجھا دیا تھا۔ اور وہ اپنی آئندہ زندگی کے لئے ایک دستورالعمل سوچ رہا تھا۔ مگر ہر دستورالعمل تاریک تھا۔ بیکار تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی زندگی کے جہاز کو ڈوبنے سے قبل ایک بار پھر بچانے کی کوشش کریگا۔ اس سے پیشتر کہ محبت کے امکان کی امید کو وہ ہمیشہ کے لئے دل سے مٹا دے۔ اس کے لئے ایک دفعہ سب سے بڑا موقعہ تلاش کریگا۔ اسکے دل کی امید وبیم کی وہی کیفیت تھی۔ جو ایک ایسے بوڑھے دولت مند کے دل کی ہو جو اپنی عمر بھر کی کمائی کے لئے ایک جائز وارث کی نہ پوری ہونے والی تمنا سے دل کو حرارت دیتا رہتا ہے ؂

اسلم نے تہیہ کر لیا کہ وہ یورپ کا ایک دورہ کریگا۔ کسی تعلیمی یا تجارتی غرض سے نہیں۔ بلکہ صرف محبت کی تلاش میں، اس زندہ متحرک بت کی تلاش میں جو اس سے محبت کر سکے۔ اور اس کی پرستش کے قابل ہو۔ کیونکہ اس کا خیال تھا۔ کہ ہندوستان میں سوائے چند محدود جگھوں کے حسن اور محبت کے نظارے میسر نہیں آ سکتے۔ ہندوستان کی بہترین دولت مقفل گھروں اور تہ بہ تہ پردوں میں مقید ہے ؂

یورپ میں شاید، حسن اپنی بیباک کیفیت بے حجابی میں، اسکے منجمد دل کو پگھلا دے۔ اس کی بیقرار آنکھیں شاید اس خیالی آرزو کی چلتی پھرتی تصویر دیکھ پائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ یورپ گیا۔ اور تین سال تک یورپ کے کونے کونے کی خاک چھان ماری۔ لیکن شاہد آرزو، کسی سراب خیالی کے نظر فریب دھوکوں کی طرح اور دور ہوتا چلا گیا۔ مگر اُف اس کی پیاس، اس تعاقب اور

گرم روی سے اس شوق اور حسرت کی تلخکامی اور تپش سے تیز ہوتی گئی۔
وہ واپس آیا۔ مگر اب اسلم وہ اسلم نہ تھا۔ دفورِ درد کے اُس احساس کُش اثر کی طرح جو کسی بیمار کو آرام اور درد دونوں سے بے نیاز کر دیتا ہے اِس ناکامیٔ تمنا نے اس کو آرام اور تکلیف، محبت اور نفرت، زندگی۔ اور موت کے تاثرات سے آزاد کر دیا تھا۔

اب وہ اس دُنیا کی مادیت کا قائل تھا۔ اور اپنے آپ کو اپنی ذات میں فنا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اب شہر سے دُور ایک خُوبصورت بنگلہ بنایا اسے بہترین سامانِ آرائش سے سجایا۔ مگر زیادہ تر اس کا وقت اپنے کتب خانے میں گزرتا۔ جسے اس نے ہر نایاب اور قابلِ دید کتاب سے بھر دیا تھا۔ ہاں اس کے گھر بھر میں کوئی تصویر نہ تھی۔ وہ تصویروں سے ڈرتا تھا۔ کیونکہ وہ زندہ انسانوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ خوبصورت عورتوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ ان عورتوں کی جن میں سے کوئی بھی.... آہ .... اس کے لئے .... نہ تھی ......

۲

ایک شام کو اسلم اپنے کتب خانہ میں ایک آرام کرسی پر بیٹھا غور کر رہا تھا، کہ شاید کسی چیز کو کبھی نہ بھولنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسے بھلا دینے کی کوشش کی جائے، کیونکہ وہ خیال جس کو بھلانے کے لئے وہ اس قدر محنت، دولت اور وقت صرف کر رہا تھا، دن بہ دن، ساعت بہ ساعت، زیادہ تیزی کے ساتھ دل نشین ہو رہا تھا۔
وہ آج صبح ہی سے اپنے کتب خانے میں تھا، اور ایک ایسے قمار باز

کی طرح، جو روز روز کی ہار سے مایوس ہو کر اپنی تمام باقی ماندہ دولت ایک ہی بازی پر لگانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، اس نے آج یہ فیصلہ کیا تھا، کہ وہ آج شام سے پہلے پہلے دریافت کر لیگا، کہ محبت کی کوئی ہستی بھی ہے کہ نہیں، کتابیں جو مضمون، زبان اور طرز ادا کے اعتبار سے مختلف تھیں چاروں طرف کھلی پڑی تھیں، وہ کبھی ایک کو الٹ کر پڑھتا، کبھی دوسری کو دیکھتا، کبھی ان سے باتیں کرتا اور پھر خود بخود ہی ہنس دیتا، یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا، کہ وہ اپنی نادانی پر ہنس رہا ہے، یا ان کتابوں کی ناکامیابی پر۔ وہ گویا ایک شرابی تھا جو ارد گرد کی تمام چیزوں کو مدہوش سمجھتا ہے اور ان سے بے حجابانہ دست درازی کرتا ہے۔

اب اس کی صاف پیشانی پر غصہ کی جھلک دکھائی دی، اس کی آنکھوں میں کسی اندرونی صدمے سے آنسو بھر آئے، اس نے بڑے زور سے اس کتاب کو جو اس کے ہاتھ میں تھی۔ زمین پر پٹک دیا اور چلا اٹھا "سب جھوٹ، سب دھوکا ہے"، یہ صرف انسان کو بے وقوف بنانے کی تدبیریں ہیں"۔

اس کے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں ایک سگرٹ جل رہا تھا، اور وہ اس کی سوزش کے اثرات سے بالکل بے خبر تھا، وہ اٹھا، اس کے چہرے سے تھکن، اس کی آنکھوں سے مایوسی، اور اس کی حرکات سے بیچینی ظاہر تھی، اب اس نے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا، معلوم ہوتا تھا، کہ اس کا دماغ بھی اس کے جسم کی طرح متحرک اور مصروف ہے۔

اس نے ایک اور سگرٹ جلایا، اور دیا سلائی کی جگہ سگرٹ کو پھینک کر دیا سلائی کو پینے لگا، پھر خود ہی اس حرکت کو سمجھنے کی کوشش کی، پھر ہنسا، اب وہ اب بڑی متانت اور سنجیدگی سے دیوار میں نظریں گاڑے کچھ سوچ رہا

تھا، اور اپنے خیالات کو خود ہی سننے کے لئے الفاظ میں متشکل کر رہا تھا۔

"بس اسی طرح جیسے میں نے اس جلتے ہوئے سگرٹ کو پھینک کر ایک بجھی ہوئی بیکار دیا سلائی کو پینا شروع کر دیا، لوگ اس مفید اور کار آمد دُنیا کے مشاغل کو چھوڑ کر ایک بے معنے خیال، ایک بے حقیقت ہستی کی فکر میں مستغرق رہتے ہیں۔ . . . . . محبت نہ صرف ایک بے معنی لفظ ہے بلکہ ایک جھوٹ ہے، جسے انسان عادتاً بولتا ہے۔ ایک فریب ہے جس میں بیکار لوگ اپنے آپ کو مبتلا کرتے ہیں، ایک مرض ہے جو وقتاً فوقتاً کمزور دماغوں کو لاحق ہو جاتا ہے۔ . . . . . "

آہ غریب اسلم! شاید تجھے معلوم نہیں کہ محبت کی مخالفت اس کی سب سے بڑی طاقت ہے، اور شاید اس وقت جب تو اس قدر شد و مد سے اسکی ہستی سے انکار کرنا چاہتا ہے، محبت کا تیر انداز دیوتا تیرے دل کو للچائی ہوئی نظروں سے تاک رہا ہے۔

وہ بہکی بہکی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا، وہ دماغ کو کسی اور خیال میں مصروف کرنا چاہتا تھا، مگر اس کوشش کی ناکامیابی اس کی آنکھوں کے اضطرار سے ظاہر تھی، یک لخت اس نے ایک جست بھری، میز کے قریب آیا اور ایک گھنٹی پر زور سے ہاتھ مارا . . . . . اس کے چہرے پر اب تسکین تھی، گویا اس نے ایک بڑے عقدے کو حل کر لیا۔

ایک معتبر صورت ملازم داخل ہُوا، اور سرکار، کہہ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا، اسلم نے کچھ نہ سُنا، اور پھر بہت زور سے گھنٹی پر ہاتھ مارا، وہ ایک بچے کی طرح

اپنے خیال سے کھیل رہا تھا، ملازم نے ذرا آگے بڑھ کر اور ذرا بلند آواز سے یاد دلایا،

'میں حاضر ہوں سرکار'۔

اسلم نے بغیر اس کی طرف دیکھے گاڑی تیار کرنیکا حکم دیا، اور ابھی ملازم دو قدم ہی چلا ہوگا کہ زور سے پکارا 'جلدی بہت جلدی'۔

وہ ایک لحظہ بھر بھی اس کمرے میں نہ رہنا چاہتا تھا، اس آواز نے ملازم کی قوتِ فعلیہ پر ایک برقی اثر کیا، اور وہ بھاگا۔ . . . . ابھی دو منٹ بھی نہ گزرنے پائے تھے، کہ وہ بالکل بیقرار ہو گیا ——— وہ حیران تھا، کہ کیا گاڑی کے تیار کرنے کے لئے دو مکمل دنوں کی ضرورت ہُوا کرتی ہے۔ وہ وقت کا ناقابلِ برداشت بوجھ محسوس کر رہا تھا، اسے آج وقت آہستہ آہستہ رینگتا ہُوا دکھائی دیتا تھا، وہ بے صبری سے باہر نکلا، اور گاڑی کو اپنے دروازے کے سامنے نہ دیکھ کر آج پہلی مرتبہ سائیس کو اس کے کام کی اہمیت اور وقت کی قیمت بتانے کے لئے اصطبل کی طرف چلا ——— وہ صرف وقت گزارنا چاہتا تھا ———

اصطبل کے دروازے پر پہنچ کر اُسے بڑی حیرت ہوئی، اس کو توقع تھی کہ وہ سائیس کو حقہ پیتے ہوئے، ملازم کو باتیں کرتے ہوئے اور گھوڑے کو ابھی تھان پہ بندھے ہُوئے پائے گا، مگر وہاں معاملہ بالکل برعکس تھا سب کے سب ایک غیر معمولی دلچسپی اور تیزی سے گاڑی تیار کرنے میں مصروف تھے، ——— سائیس کی لڑکی دھنیا بھی ایک جھاڑن سے گاڑی صاف کر رہی تھی، ——— وہ اپنے حکم کی تعمیل کو ایک عملی شکل میں دیکھ کر خوش ہُوا۔ اسے اپنے لفظ کی اہمیت کا احساس ہُوا، خدا کے اتنے بندے اس کی مرضی

کو پورا کرنے کے لئے اپنی قوتیں صرف کر رہے تھے، وہ دو چار قدم آگے بڑھ گیا، اب اس کی آنکھیں صرف ایک حرکت کو اپنے محدود حلقوں میں جذب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کا دماغ صرف ایک حرکت کو سمجھنے کی فکر میں تھا، یہ حرکت ایک نازک، سانولے، چاندی کے کنگن والے ہاتھ کی تھی، جو گاڑی کو صاف کرنے میں مصروف تھا، دھنیا کی پشت اسلم کی طرف تھی ـــــ وہ صرف ایک بلند، سڈول اور صحت مند جسم کی قامت کو دیکھ سکتا تھا، اور صرف اس سانولے ہاتھ کو جو برابر اِدھر سے اُدھر حرکت کر رہا تھا، . . . . . .

اسلم کا پاؤں ایک اینٹ سے جو راستہ میں پڑی تھی رکا، ایک آہٹ پیدا ہوئی، اور وہ سب لوگ جو گاڑی کو تیار کر رہے تھے، اِدھر متوجہ ہوئے . . . . . .

مگر اسلم کچھ دیکھ نہ سکا، اس کی آنکھوں نے پہلے کسی دور دراز پہاڑ پر چمکنے والی بجلی کو دیکھا، پھر ایک برسات کی چڑھی ہوئی ندی کی رفتار کا اندازہ کیا، اور پھر اس کے لئے دُنیا تاریک ہوگئی ـــــ

دھنیا، اپنے آقا کو دیکھتے ہی شرما چکی تھی، اور جھاڑن کو پھینک کر تیزی سے اپنی کوٹھڑی کی طرف بھاگ کر غائب ہو چکی تھی، ـــــ

اسلم کچھ سمجھ نہ سکا، سائیس گاڑی کو دروازے پر لایا، اسلم چپ چاپ سوار ہوگیا، سائیس حکم کا منتظر تھا، اسلم ذرا گھبرا کر چونکا، اور چلو، کہہ کر پھر خاموش ہوگیا، گاڑی چلی، اسلم نے ایک جذبۂ بے اختیار سے مُڑ کر اصطبل کی طرف دیکھا، اسے ایسا معلوم ہُوا کہ وہ کوئی قیمتی چیز بھول گیا ہے، یا اس مجموعہ میں جس کا نام اسلم ہے کسی اہم چیز کی کمی واقع ہوگئی ہے

وہ اس چیز کو یاد کرنے کے لئے دماغ پر زور دے رہا تھا،

ابھی گاڑی نے مشکل سے کوئی دس گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا، کہ اسلم نے سائیس کو واپس ہونے کا حکم دیا، شریر، چالاک اور تندرست گھوڑا اس قدر جلد واپس کئے جانے پر بھڑکا، بوڑھے سائیس نے اپنے کمزور ہاتھوں کی طاقت کے اظہار کے لئے گھوڑے کو ایک چابک رسید کیا، گھوڑا ایک ایسے غیور اور باحمیت شخص کی طرح جو اپنی بے بسی کی حالت میں ذرا سی سبکی کو اپنی انتہائی ذلت سمجھ کر بگڑتا ہے، بگڑا اور تین چار ایسی زقندیں بھریں، کہ گاڑی اصطبل کے دروازے کے سامنے آکر الٹ گئی، سائیس نے گرتے ہی ایک چیخ ماری، گاڑی کے الٹنے کی آواز، گھوڑے کے بیقرار شور اور سائیس کی چیخ کو سن کر نوکر چاکر اصطبل اور کوٹھی سے بھاگے ان میں دھنیا بھی تھی،

سائیس کو کوئی چوٹ نہ آئی تھی، مگر اسلم گاڑی سے کوئی سات قدم پرے گر کر بیہوش ہو چکا تھا، ہمدردی اور غمگساری کے اس فطری تقاضے سے مجبور ہو کر جو عورت کو مرد کے لئے ایک لازوال نعمت بنا دیتا ہے، دھنیا، اسلم کی طرف دوڑی اور پھر کچھ سمجھ کر پلٹی، ساتھ ہی نل سے پانی کا ایک چلو بھر کر لائی۔ اور اس سے پیشتر کہ مرد نوکروں کا وہ متحیر اور ششدر جم غفیر کچھ کر سکتا، ایک عورت نے اپنے انہی نازک، سانولے اور چاندی کے کنگنوں والے ہاتھوں سے اسلم کے چہرے پر پانی کے دو چھینٹے دئے۔

اسلم نے ذرا تڑپ کر آنکھیں جھپکیں، اور پھر ٹکٹکی لگا کر اس صورت

کو جواب اپنی پوری شانِ بے حجابی سے اس کے سامنے تھی، دیکھنے لگا، دھنیا نے پانی کے بے شمار قطروں کو جو موتیوں کی طرح اسلم کے چہرے پر ڈھلک رہے تھے، اپنے آنچل سے صاف کر دیا،

دھنیا، سائیس کی بیٹی تھی، مگر عورت تھی، عورت اپنے فرض کی ادائیگی میں وقت موقع اور محل کی تلاش نہیں کرتی، جس طرح محض قدرت کی طرف سے کسی خاص جڑی بوٹی میں اکسیر کا اثر ہوتا ہے، بالکل اسی طرح عورت کے ہاتھ میں ایک مسیحائی اثر ہے، اس کا ذرا سا اشارہ، اس کا خفیف سا سہارا، برسوں کی تکلیف، اور مدتوں کے آلام کو زائل کر دینے کے لئے کافی ہے دکھے ہوئے دلوں کی تسکین، برباد گھروں کی آبادی، قدرتی بیماریوں کا قدرتی علاج صرف عورت ہی ہے۔

وہ اپنا فرض ادا کرنے کے بعد چلی، اسلم کی پُرنم آنکھیں جن میں احسانمندی، اور شکرگزاری کی ایک لہر موجزن تھی، ایک کمزور اور تھکے ہوئے مگر ارادت مند پجاری کی طرح اس کے پیچھے پیچھے جا رہی تھیں۔ . . . . . اور اسلم کے سمجھ دار دماغ سے بے خبر اس کے بے پناہ دل پر ایک اندھا بچہ اپنی تیراندازی کی مشق کر رہا تھا۔

۳

آج اسلم اپنی کوٹھی کے ہشت پہلو کمرے میں ایک خوبصورت اور آرام دہ صوفے پر ایک رنگین تکیہ کے سہارے بیٹھا تھا، اس کے چہرے پر سکون تھا، وہ سکون، جو کسی لمبی اور تکلیف دہ بیماری کے بعد چہرے پر ظاہر ہوتا ہے، وہ سکون، جو ایک خوفناک طوفان کے بعد سمندر

کی سطح پر نمایاں ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ اس کا ہر عضو آرام اور اطمینان کے مزے لے رہا ہے، یہ ہشت پہلو کمرہ کوٹھی کا سب سے زیادہ شاندار اور آراستہ کمرہ تھا، مگر اسلم آج صرف دوسری دفعہ اس کمرے میں آیا تھا، ہاں اس کمرے کی ایک ہی کمی، جو ہر قسم کی تصویروں کی غیر موجودگی سے، ہر دیکھنے والے کو محسوس ہوا کرتی تھی، اب پوری کر دی گئی تھی، —
تصویریں ایک انتقامی ولولے کے ساتھ ہر دوسری آرائش کو پس پشت ڈال رہی تھیں، وہ تصویریں، جن کو اسلم نے پچھلے ہفتے میں اس ذوق و شوق سے خریدا تھا، کہ گویا یہی ایک کام اس کی زندگی کا منشاء و مقصد ہے۔

اسلم کی نظروں کے سامنے دیوار پر ایک بہت بڑی رنگین تصویر آویزاں تھی یہ انسانی دستکاری کا بہترین نمونہ تھی، اس کے نیچے روشن حروف میں فتح حسن لکھا تھا، یہ تصویر ایک حسین عورت کی تھی، جو ایک متکبرانہ انداز سے ایک خوشنما درخت کی ڈال کے ساتھ جھکی ہوئی کھڑی ہے، درخت کے ارد گرد خوبصورت پرندے تھے، جو ظاہراً طور پر اس کے قدموں پر تڑپ تڑپ کر جان دینے کو مآل زندگی تصور کئے ہوئے ہیں، اِدھر اُدھر کے گھنے جنگلوں سے وحشی درندے پرستارانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے، سامنے کے روشن دان سے کبھی کبھی ایک عجیب پُراسرار روشنی اس تصویر پر منعکس ہوتی تھی، جس سے اس بے جان تصویر میں زندگی کی عارت پیدا ہو ہو کر رہ جاتی تھی،
کمرے کے دائیں کونے میں ایک ہاتھی دانت کی مرصع اور خوش وضع

تہ پائی پر ایک نوجوان لڑکی کا مجسمہ رکھا تھا، جو ابھی ابھی خواب نوشین سے بیدار ہو کر انگڑائی لے رہی ہے، دونوں باہیں ایک ذرا پیچھے کی طرف جھکے ہوئے سر کے اوپر اس خوبصورت بت کا محراب بن گئی تھیں، کھلے ہوئے سیاہ اور لمبے بالوں نے چہرے کے ایک حصہ کو چھپا رکھا تھا، اس کے نیچے اسی طرح روشن حروف میں "فتنہ بیدار" لکھا تھا۔

اسلم کے بائیں پہلو کے قریب ایک آبنوس کے خوبصورت مگر بڑے پشتیبان کے ساتھ ایک اور تصویر رکھی تھی جو "بارگاہِ عشق" کے نام سے موسوم تھی، اس میں عشق کا دیوتا، حور پیکر پری جمالوں کے عقد ثریا میں گھرا ہوا ایک پھولوں کے تخت پر جلوہ افروز تھا، ایک خوبصورت مگر سرکش حسین لڑکی کو زنجیروں میں مقید کر کے اس کے حضور میں لا رہے تھے، جسے دیکھ کر وہ اپنا پھولوں کا ترکش سنبھال رہا تھا۔

اسلم ان سب تصویروں کو یوں دیکھ رہا تھا، گویا وہ کسی بیہوش کرنے والی شراب کے دریا ہیں، اور اس کی پیاسی آنکھیں تہیہ کر چکی ہیں کہ آج ان دریاؤں کو سُکھا[1] دیا جائیگا، مگر وہ کبھی کبھی گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگ جاتا کیونکہ جس کسی تصویر کو وہ دیکھتا تھا، اس کی شکل و صورت میں آہستہ آہستہ ایک تغیر شروع ہو جاتا تھا، کچھ وقفے کے بعد اس کی آنکھوں کو دھنیا کے سوا اور کوئی تصویر نظر نہ آتی تھی۔

ہفتہ بھر اس کی یہی حالت رہی تھی، یعنی اس وقت سے جب اس نے دھنیا، کو پہلے دیکھا تھا، اس ہفتہ کا ایک ایک دن اس ایک ایک دن کی

---

[1] خشک کر دینا۔

ایک ایک ساعت اس کے لئے ایک مسرت مجسم، ایک تبسم لازوال بن گئی تھی، جس چیز کو وہ دیکھنا چاہتا تھا، اب اس کی آنکھوں کے سامنے تھی، جس جذبہ کو وہ محسوس کرنا چاہتا تھا، اب اس کے دل میں تھا، اب ہر ایک چیز اسکے لئے ایک معنی رکھتی تھی، اب اس کی زندگی ایک مقصد کے لئے وقف ہوگئی تھی، اب اس نے عورت کی پیدائش کا راز معلوم کر لیا تھا۔

اس ہفتہ کے سات دن اس کے لئے سات سال ہو گئے تھے، ان سات دنوں میں دھنیا کے متعلق کوئی سات ہزار تجویزیں اس کے ذہن میں آئیں، سب سے پہلے اس کے دماغ میں وہی خیال آیا، جو ہر معمولی مرد کے دماغ میں ایک خوبصورت عورت کو دیکھ کر آسکتا ہے، اس نے اس پر ایک بیجان جان دار کی طرح ملکیت کا قبضہ حاصل کرنیکی تجویز کی، اس کی قیمت لگائی، مگر ہر قیمت اس کے حسن کو خریدنے کے لئے کم تھی، پھر اس خیال کو ایک ناپاک، نازیبا، اور بالکل عامیانہ سمجھ کر چھوڑ دیا ـــــ پھر اس نے شادی کرنیکی تجویز کی، مگر آہ ـــــ

دھنیا کے مذہب کا تعصب، دھنیا کی قوم کی عصبیت، دھنیا کی ذات کی دیوار اس کے ارادے اور اس کی تکمیل کے درمیان حائل تھی، وہ جانتا تھا کہ دھنیا کی غریب اور محنت کش برادری کسی قسم کے بیرونی دخل کو اپنی انتہائی ذلت تصور کرتی ہے ـــ وہ اپنے مقدمات کو عدالت کے دروازوں تک لیجانے سے احتراز کرتی ہے ـــ اس وقت اُسے محسوس ہُوا، کہ انسان نے انسانی حقوق کو پامال کرنے کے لئے کس قدر حیوانیت سے کام لیا ہے، وہ گھبرا گیا، مگر اس نے ایک پوری رات کی نہ ختم ہونے والی گھڑیوں میں ٹہل ٹہل کر، اس مسئلہ کو حل کر لیا، اس نے فیصلہ کیا کہ وہ عام

انسانوں اور اُن کے قاعدوں سے ایک بہتر روش اختیار کریگا۔

اس کی روح تکالیف کو برداشت کر کر کے جسمانی آلایشوں سے پاک ہو چکی تھی، وہ سوچ رہا تھا، اور اپنے کمرے کی ساکن اور خاموش دیوار کو کچھ سمجھا رہا تھا، "جس چیز سے محبت کیجائے، وہ یقیناً خوبصورت معلوم ہوتی ہے، خوبصورت اور محبوب چیز کو مقدس سمجھنا چاہیئے، مقدس بتوں کی عزت کی جاتی ہے، پرستش کی جاتی ہے، مقدس چیزوں کو لوگ ہاتھ نہیں لگاتے، دُور سے دیکھتے ہیں۔ ..... شاید ان کو آنکھوں سے دیکھنا بھی خلافِ ادب ہے، عاشق و معشوق میں بُعدِ مکانی ضروری ہے، تاکہ وہ روحانی تسلسل، وہ برقی ارتباط جو اجسام کے وصال میں ناممکن ہے، قائم ہو سکے چھُونے سے مقدس اشیاء کی پاکیزگی فنا ہو جاتی ہے ..... انکے اسرار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ محبت مقام پرستش کی ایک منزل ہے، مقدس اشیاء سے مادی مُفاد کی اُمید درست نہیں، کیا ایک مفید اور کارآمد چیز سے بھی محبت کی جا سکتی ہے؟ ..... تعجب ہے کہ لوگ اِن عورتوں کو جن سے وہ محبت کرتے ہیں اپنی بیویاں بنانا چاہتے ہیں" وہ بڑے زور سے ہنسا، لوگوں کی جہالت پر، اس عام خیال کی بیہودگی پر، اور پھر اپنی کامیابی پر خوش ہُوا، وہ اپنی بند آنکھوں میں ایک نئی دُنیا کو دیکھ رہا تھا۔

اس واقعہ کے بعد دو تین روز اور گزر گئے تھے، اور آج وہ اتنا خوش تھا کہ اُسے اپنی مسرت پر خود حیرت ہو رہی تھی، اور اس لئے وہ آج ارادتاً اس آراستہ کمرے میں اپنی خوشی کو خود محسوس کرنے کے لئے بیٹھا تھا،

خوب جانتا تھا پانی کے دو چھینٹے دینے کے سوا دھنیا نے اور کچھ نہیں کیا تھا ——

"اس احسان کا شکریہ ادا کرنا ناممکن ہے!"

بیچارہ سائیس کچھ نہ سمجھا، اس نے صرف اتنا ہی کہا،

"وہ آپ کی لونڈی ہے"

اسلم اس جواب کو سننے کے لئے تیار نہ تھا، وہ جلدی میں خدا جانے کیا کیا کہہ گیا،

"لونڈی نہیں ملکہ ہے، وہ عورت ہے، وہ مرد کی قسمت ہے، وہ نیکی کی دیوی ہے، وہ احسان کی مجسم تصویر ہے، ——

تم نے کیا کہا لونڈی ہے...... تم نے گناہ کیا ہے، توبہ کرو، وہ عورت ہے وہ ماں ہو سکتی ہے، وہ بہن ہو سکتی ہے، وہ بیٹی ہو سکتی ہے، وہ بیوی ہو سکتی ہے، مگر لونڈی کبھی نہیں ہو سکتی........ تم اسکے باپ ہو، اس لئے میں تمہیں معاف کرتا ہوں"

اسلم کے دل کی حرارت کو کون سمجھ سکتا تھا، جس احساس کو محسوس کرنے کے لئے، اس نے اپنی عمر کی بہترین ساعتیں بیکار صرف کی تھیں، جس جذبہ کی زندہ تصویر دیکھنے کے لئے اس کے دن کا آرام اور رات کی نیند حرام ہو گئی تھی، اس احساس کو، اس جذبے کو، اس نے دھنیا کے ہاتھ کی ایک حرکت میں دیکھ لیا تھا، اس کی ایک نظر میں محسوس کر لیا تھا،

دھنیا اس کے لئے صرف ایک پرستش کے قابل چیز تھی، وہ اپنے دل ہی دل میں کچھ فیصلہ کر چکا تھا، اور جس کام کے لئے وہ اپنے آپ کو تیار کر چکا تھا، اسے کرنا چاہتا تھا، اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا، اور

ایک لفافہ نکالا، اس میں بنک کی ایک کتاب اور ایک مکان کا قبالہ تھا، اس نے ایک ایسے عقیدت مند پجاری کی طرح جو پھولوں کا ایک حقیر ہار اپنے دیوتا کے قدموں پر نچھاور کرتا ہے، اس لفافہ کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بڈھے سائیس کی طرف بڑھایا، اور کہا، "لو یہ میری طرف سے دھنیا کو دیدو، یاد رکھو۔ یہ اس کے احسان کا عوض نہیں، وہ کبھی ادا نہیں ہو سکتا، اس کو میں ادا کرنا نہیں چاہتا، اس کے نام پچاس ہزار روپے بنک میں جمع کرا دئے گئے ہیں،

یہ اس کے حساب کی کتاب ہے، اور یہ اس سامنے والی کوٹھی کا قبالہ ہے آج سے وہ کوٹھی میری نہیں دھنیا کی ہے"

سائیس مبہوت تھا، اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے، وہ گرنا چاہتا تھا، اس کا دماغ اس کے کانوں کے خلاف بغاوت کر رہا تھا، اس نے سنبھل کر کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر اس سے پیشتر کہ وہ منہ سے کوئی لفظ نکال سکتا، اسلم نے دراز ور سے چلا کر کہا "ایک لفظ نہیں، ایک حرف نہیں، میں شکریہ نہیں چاہتا، جاؤ"

سائیس ایک بیجان مگر متحرک بت کی طرح دروازے کی طرف حرکت کر رہا تھا، وہ نظروں سے غائب ہو گیا، اسلم ایک پُر کیف انداز سے اُٹھا، اسکے چہرے پر آسمانی نور کی ایک جھلک تھی، اسکے لبوں پر تبسم تھا، اسکی آنکھیں کسی اندرونی روشنی سے چمک رہی تھیں، اور اُسکو وہ اطمینان قلب وہ روحانی تسکین، وہ جسمانی آرام میسّر تھا جو صرف ایک نیکدل انسان کو ایک نیک کام کی تکمیل کے بعد ہی میسّر آسکتا ہے۔

(حسن کی قیمت)

تولہ بھر ریڈیم

(از ظفر الملت مولینا ظفر علی خاں صاحب بی۔ اے)

کچھ دن ہوئے لندن کے چند بیفکروں نے ایک جگہ جمع ہو کر یہ سوچنا شروع کیا کہ تفریح و دلچسپی کا ایسا کونسا مشغلہ ہو سکتا ہے کہ وقت بھی بڑے مزے میں گذرے اور گرہ سے بھی کچھ خرچ نہ ہو۔ یہ لوگ انگریزی سوسائٹی کا خلاصہ اور انگلستان کی شرافت کا عطر تھے۔ ان میں سے کوئی ڈیوک تھا۔ کوئی بیرن کوئی پارلیمنٹ کا ممبر تھا اور کوئی فوجی افسر۔ سب کے سب مجرد تھے اور اس آزادی کے صدقے میں جس کے لحاظ سے انگلستان کے مرد و عورت زبان زد خاص و عام ہیں۔ سبھی طرح کے گلچھرّے اُڑا چکے تھے۔ کوئی ایسی ہوس نہ تھی جو انہوں نے پوری نہ کی ہو اور کوئی ایسا پاپڑ نہ تھا جو اُنہوں نے نہ بیلا ہو۔ زندگی کا لُطفِ خاص طور پر حاصل کرنے کے لئے اب اُنہیں کسی ایسے مشغلہ کی ضرورت تھی جو بڑا ہی انوکھا ہو۔

سوچتے سوچتے آخر ایک کی طبیعت لڑ گئی اور اُس نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم لوگ ایک انجمن نقب زنی قائم کریں جس کی رُکنیت کی فیس یہ ہو کہ ہر رُکن سال میں ایک دفعہ لندن کا کوئی گھر جسے صدرِ انجمن صاحب تجویز کریں پھوڑا کرے۔ اس تجویز پر سب نے بہ اشتیاق تمام صاد کیا اور ایک

باقاعدہ انجمن نقب زنی قائم ہوگئی۔ جس کے ارکان کی تعداد ایک رکن کی تحریک کی بنا پر الف لیلہ کے مشہور علی بابا اور چالیس چوروں والے قصہ کی مناسبت سے چالیس تھی۔

ایک دن جب بعض ضروری امور پر غور کرنیکے لئے اس انجمن کا باقاعدہ اجلاس ہوا تو صدر انجمن نے پہلے تو بلا کسی تمہید کے حاضرین سے یہ کہا کہ ریڈیم جیسی نایاب چیز بہ مقدار کثیر موجود ہوگئی اور اُس کے بعد جیب میں سے ایک اخبار نکال کر حسب ذیل عبارت پڑھنی شروع کی:۔

"کچھ عرصہ ہوا کہ آدھ سیر ریڈیم کی قیمت آٹھ لاکھ چھیانوے ہزار پاؤنڈ (ایک کروڑ چوبیس لاکھ چالیس ہزار روپیہ) بتائی گئی تھی۔ جن جن لوگوں کے پاس اس نادر الوجود عنصر کی کوئی مقدار بہ غرض فروخت موجود ہو اُنہیں ہم مشورہ دیتے ہیں کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اسے علیحدہ کر ڈالیں کیونکہ پروفیسر بلتھ نے اس عنصر کے بمقدار کثیر بہم پہنچانے کا ایک حیرت انگیز طریقہ دریافت کرلیا ہے۔ چنانچہ اس طریقہ کے مطابق پروفیسر موصوف نے تولہ بھر ریڈیم جس کی قیمت بازار کے بھاؤ سے تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپے ہوتی ہے تیار کرلی ہے اور چند خاص خاص ماہرین علم کیمیا نے پروفیسر بلتھ کے کارخانہ میں جا کر اس کی اصلیت کے متعلق اپنی تشفی کرلی ہے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ جلد آنے والا ہے جب ریڈیم نظری دنیا سے عملی دنیا میں آجائیگی اور اس کا شمار تمدن کی بڑی قوتوں میں ہونے لگیگا چونکہ اس عجیب و غریب عنصر کے چھوٹے سے ٹکڑے میں تاثیر موجود ہے کہ ایک متوسط الحال شخص کے آتش دان کو دو ہزار سال تک کوئلہ کی احتیاج سے مستغنی رکھ سکے لہذا ظاہر ہے شہروں میں دھوئیں کی وجہ

سے آجکل جو تکلیف ہوتی ہے وہ بالکل جاتی رہیگی۔ دخانی جہازوں کو کوئلہ کی کانوں کے بیکار ہو جانے کی وجہ سے کوئی دس لاکھ مزدوروں کو معاش کی کوئی دوسری شکل نکالنی پڑیگی۔"

ایک رکن:۔ "ہوگا تو بڑے مزے کا زمانہ۔"

دوسرا رکن:۔ "لیکن اسے ہماری آج کی کارروائی سے کیا تعلق؟"

صدرِ انجمن:۔ "مجھے بات پوری تو کر لینے دی ہوتی اسکے بعد ٹوکا ہوتا۔"

دوسرا رکن:۔ "ارشاد ہو۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں۔"

صدرِ انجمن:۔ "ہمارے سکرٹری صاحب نے جو سالانہ رپورٹ پیش کی ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ میجر جیرلڈ براؤن کا چندہ بابت سال گذشتہ ابھی تک وصول نہیں ہُوا۔ لہذا میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ میجر براؤن یہ تولہ بھر پیدیم مالیتی تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپیہ پروفیسر بلتھ کے مکان سے لاکر انجمن کے اجلاس آئندہ میں پیش کریں۔ اگرچہ ساتھ ہی میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اس معزز انجمن کی رکنیت کی شان اس سے بہت اونچی ہے کہ تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپیہ جیسی ہیچ میرز رقم اس کے برقرار رکھنے کا کافی معاوضہ ہو سکے۔"

اس فیصلہ کی تعمیل کے خیال سے گذشتہ ماہ اپریل کی پہلی تاریخ کو آدھی رات کے وقت میجر جیرلڈ براؤن پروفیسر بلتھ کے مکان واقع لڈگیٹ سرکس کے پچھواڑے کی دیوار پھاند کر مکان کے اندر داخل ہُوئے۔ میجر صاحب کا طرزِ عمل وہی تھا جو ایک معمولی چور کا ہوتا ہے۔ آپ کھڑکی توڑ کر ایک کمرہ میں گھسے یہ کمرہ پروفیسر کا معمل یا دار التجربہ تھا چونکہ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہُوا تھا لہذا میجر براؤن نے جیب میں سے ایک چھوٹی سی برقی لالٹین نکال کر روشن کی اور ہر طرف نگاہ ڈالی۔ سامنے ایک دروازہ نظر آیا۔

ایک چٹخنی کھول کر وہ آگے بڑھا کچھ دُور جا کر دہنے ہاتھ کی طرف ایک دروازہ اور دیکھا جس کے پٹ بالکل کھُلے تھے۔ دروازہ میں سے اُسے جو کچھ نظر آیا وہ اسے محوِ حیرت و استعجاب کرنے کے لئے کافی تھا۔ کمرہ کے وسط میں میز پر ایک چمکدار چیز رکھی ہُوئی تھی۔ مقابل والی دیوار پر کوئی ایک فٹ مربع جگہ اس چمکدار چیز کے عکس کی وجہ سے نورانی ہو رہی تھی۔ یہ ریڈیم تھا۔ میجر کو تعجب ہُوا کہ پروفیسر نے ایسی بیش بہا چیز کو کیوں اس طرح سے کھُلا چھوڑ دیا۔ یہ ظاہر تھا کہ پروفیسر نے سائنس دانوں کے دکھانے کے لئے اسے یہاں رکھا تھا لیکن تین لاکھ چونسٹھ ہزار کا مال کھُلے کمرہ میں میز پر رکھ دینا ایسی لغویت تھی جس کا ارتکاب پروفیسر کے سوا کوئی دوسرا کرتا تو اوّل درجہ کا پاگل سمجھا جاتا۔ لیکن یہ ایسا وقت نہ تھا۔ کہ میجر برون پروفیسر کے قوائے ذہنی کی صحت و عدم صحت پر کھڑا ہُوا غور کیا کرتا۔ چنانچہ وہ میز کی طرف بڑھا لیکن دہلیز کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ دروازے کے پٹ بڑے زور سے بند ہوئے۔ میجر حیران ہُوا کہ دروازہ کیسے بند ہُوا کیونکہ نہ ہَوا تھی نہ کوئی شخص موجود تھا جس نے دروازہ بند کیا ہو۔ کچھ دیر تک محوِ حیرت رہنے کے بعد وہ دروازہ کی طرف بڑھا کہ پٹ پھر کھول دے اور گھُنڈی گھما کر کھینچا لیکن معلوم ہُوا کہ دروازہ مقفل ہے اُس نے گھُنڈی کو ہر طرف گھُمانا دبانا شروع کیا مگر بے سود۔ چٹخنیوں کو ٹٹولا کہ بند ہونے کے دھماکے سے پیچھے والی چٹخنی تو کہیں گر نہ گئی ہو لیکن چٹخنی چڑھی ہُوئی تھی۔ اُس نے دروازہ کو پھر اچھی طرح سے دیکھنا شروع کیا۔ سوا اُس گھُنڈی کے جسے وہ ہر طرف گھُما چکا تھا اور اُس چٹخنی کے جسے وہ دیکھ چکا تھا کہ چڑھی ہُوئی ہے اور کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے دروازہ بند ہو سکتا۔ نہ کنجی کا سُوراخ تھا نہ حلقے تھے جن سے معلوم ہو کہ دروازہ مقفل ہے۔ میجر نے خیال کیا کہ ضرور ہے کہ کمرہ سے نکلنے کا کوئی دوسرا

رستہ ہو۔ اس خیال سے اُس نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا مگر کوئی کھڑکی یا دروازہ یا روشندان نظر نہ آیا۔

تب تو میجر بہت ہی سٹ پٹایا اور دل میں کہنے لگا: "بُرے پھنسے! خدا ہی ہے جو یہاں سے رہائی ملے اور یہ سب میری بیوقوفی۔ مجھے چاہیئے تھا کہ دروازے کی طرف سے اطمینان کر لیتا تب اندر گھستا۔ افسوس کہ مجھ جیسا آدمی جو شاہی گارد کا میجر ہو اور پارلیمنٹ کا ممبر ہو وہ معمولی چوروں کی طرح اقدامِ نقب زنی میں چالان کیا جائے۔

اس خیال سے اُس کا دماغ چکرانے لگا اور بدن میں رعشہ پڑ گیا۔ اُس پر اُسے اور غصہ آیا اور دل میں سوچنے لگا کہ میں اس سے زیادہ خطروں میں مبتلا ہو چکا ہوں لیکن کبھی مجھے ایسی گھبراہٹ نہ ہوئی جیسی اس وقت ہے۔ وہ انہیں خیالات میں مستغرق تھا۔ کہ دفعتہً گھنٹی بجی جسے سُنتے ہی وہ چونک پڑا پیچھے پھر کے دیکھا تو کمرہ کے کونے میں ٹیلیفون لگا ہُوا پایا جس کی گھنٹی بج رہی تھی، اس سے اُس کے رہے سہے اوسان اور جاتے رہے۔ جب گھنٹی بجنی موقوف ہی نہ ہُوئی تو بہ مجبوری ٹیلیفون کے پاس گیا اور کان لگا کر سُننے لگا۔ آواز آئی "کون ہو؟" میجر نے کچھ جواب نہ دیا۔ دوبارہ آواز آئی "کون ہے؟ میجر پھر بھی چُپ ہی رہا۔

آواز: "اگر جواب نہ دو گے تو ابھی پولیس کے سپاہی کو بُلا کر تمہیں گرفتار کر دیا جائیگا"

میجر (یہ دیکھ کر کہ اگر جواب نہ دیا تو پولیس کا سپاہی آکر حقیقت میں ہتکڑی ڈالیگا) "کہو کیا کہتے ہو"؟

آواز: "خوب! کہو کیسے ہو؟"

میجر:" بڑے مزے میں ہوں۔ کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟"
آواز:" تمہارا نام کیا ہے؟"
میجر (یہ خیال کرکے کہ صحیح نام بتانا ٹھیک نہیں)" رچرڈ مارکھم"
آواز:" آپکی عمر کتنی ہے؟"
میجر (یہ یقین کرکے کہ یہ ضرور کوئی بیمہ کمپنی کا ڈاکٹر ہے جو اسے پروفیسر بلتھ کا نائب سمجھ کر یہ باتیں پوچھ رہا ہے)" میری عمر تو جو کچھ ہے وہ ہے مگر یہ تو فرمائیے کہ یہ آدھی رات کے وقت آپکو اپنی معلومات میں اس اضافہ کی کیا ضرورت ہے؟"
آواز (میجر کے سوال پر مطلق التفات نہ کرکے)" آپ کی عمر؟ جلدی کیجئے"
میجر:" پینتیس سال (اپنے دل میں) ایسے آڑے وقت میں سچ کے سوا چارہ نہیں"
آواز:" رچرڈ مارکھم۔ عمر پینتیس سال۔ پیشہ؟"
میجر:" سپہگری"
آواز:" بہت ٹھیک۔ رچرڈ مارکھم۔ عمر پینتیس سال۔ پیشہ سپہگری ابھی تک ملازمت میں ہیں یا پنشن ملتی ہے؟"
میجر:" پنشن پاتا ہوں"
آواز:" اچھا تو سنئے۔ رچرڈ مارکھم عمر پینتیس سال۔ پیشہ سپہگری۔ حال پنشن یاب مگر آپ کس درجہ بیوقوف ہیں کہ ریڈیم کے ایک ٹکڑے کی خاطر اپنے پیشہ کو دھبہ لگاتے ہیں اور پنشن سے ہاتھ دھوتے ہیں"
میجر:" (شرمندہ اور متحیر ہوکر)" کیا کہا"؟
پروفیسر:" میں نے یہ عرض کیا کہ ریڈیم کے ایک ٹکڑے کی خاطر آپ اپنی پنشن کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟"
میجر:" میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم بک کیا رہے ہو"

پروفیسر:۔ بہت اچھا۔ میں کوشش کرونگا کہ زیادہ وضاحت سے کام لوں۔ جناب والا آپ چور ہیں۔ آیا خیال شریف میں؟ آپ ریڈیم چرانے آئے تھے لیکن پروفیسر بلتھ کے مکان میں بند ہو گئے۔"

میجر۔ (گھبرا کر) "ابے تو ہے کون؟"

آواز:۔ "پروفیسر بلتھ۔"

میجر:۔ "لعنت بہ کارِ شیطاں۔"

پروفیسر:۔ "نہیں جناب بہ کارِ پروفیسر بلتھ کنیے۔"

میجر:۔ "آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟"

پروفیسر:۔ "میں برآمدہ کے پہلو والے کمرہ میں ہوں۔ میں جس جگہ کھڑا ہوں وہاں سے آپکے دروازہ کا کمرہ نظر آتا ہے اور میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول ہے۔"

میجر:۔ "آپ چاہتے کیا ہیں؟"

پروفیسر:۔ "میری منشا کا انحصار آپکے طرزِ عمل پر ہے۔"

میجر:۔ "وہ کیسے۔"

پروفیسر:۔ "وہ ایسے کہ آپ چاہیں تو آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے اور چاہیں تو مجھے سائنس کے اکتشافات میں مدد دیں کہئے کیا صلاح ہے؟"

میجر:۔ "یہ سائنس کے اکتشافات کیا بلا ہوتے ہیں؟"

پروفیسر:۔ "آپ ایک بارہ فٹ مربع کمرہ میں مقید ہیں جس میں ایک تولہ بھر ریڈیم رکھا ہوا ہے۔"

میجر:۔ "اچھا پھر۔"

پروفیسر:۔ "پھر یہ کہ آپ دنیا میں پہلے آدمی ہیں جو اتنی قلیل الحجم جگہ میں اتنے کثیر المقدار ریڈیم کے ساتھ بند ہوئے۔ اس لئے آپکے محسوسات

سائنٹیفک دنیا میں بہت گراں بہا سمجھے جائیں گے۔ اس لئے اگر آپ اُس وقت تک جب تک آپکے ہوش و حواس بجا رہیں اپنے محسوسات سے مجھے بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دیتے رہنے کا وعدہ کریں تو خیر ورنہ ابھی پولیس کو بُلاتا ہوں۔ ان دونوں میں سے آپ کونسی بات پسند کرتے ہیں؟"

میجر:" آپکی توجہات کہ آپ نے یہ معاملہ میری رائے پر چھوڑا میں چاہتا ہوں کہ اپنے محسوسات بیان کرکے آپ کے علم میں اضافہ کردوں"

پروفیسر:" جناب رچرڈ مارکھم صاحب میں آپکا نہایت ہی شکر گذار ہوں لیکن آپکو پہلے سے متنبہ کئے دیتا ہوں کہ آپ کو جسمانی تکلیف بہت کچھ برداشت کرنی پڑیگی۔ میرا تجربہ کئی گھنٹے سے پہلے ختم نہ ہوگا اور چاہے آپ کو کتنی ہی تکلیف محسوس کیوں نہ ہونا ممکن ہے کہ دوران تجربہ میں کمرہ کھول کر آپ کو نکل جانے دوں کیئے آپ راضی ہیں یا پولیس"

میجر (جلدی سے بات کاٹ کر) میں تو کہہ چکا کہ پولیس کے مقابلہ میں مجھے آپ کا سائنس زیادہ عزیز ہے"

پروفیسر:" نہایت مہربانی۔ ہاں یہ تو فرمایئے آپ کا قلب کیسا ہے؟"

میجر:" نہایت زبردست۔ گھنڈ کی طرح آواز دیتا ہے"

پروفیسر:" نہایت ہی خوب۔ اس قسم کے تجربہ کے لئے دل چاہیئے بھی ایسا ہی"

میجر:" (دل میں) یا اللہ بُرے پھنسے (پروفیسر سے مخاطب ہوکر) آپکو کچھ اور پوچھنا ہے؟"

پروفیسر:" بہت کچھ۔ گھڑی ہے؟"

میجر:" ہاں ہے"

پروفیسر:" آپ ضرباتِ نبض بتا سکتے ہیں؟"

میجر: "بیشک۔"

پروفیسر: "جناب والا آپ تو موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں۔ میں نہایت ہی ممنون ہوں کہ آپ نے آدھی رات کو غریب خانہ میں قدم رنجہ فرمایا۔ اس کمرہ میں آپ کو بند ہوئے ۵ منٹ تیس سکنڈ ہو چکے ہیں۔ اب بتائیے آپ کی نبض کی رفتار کیا ہے؟"

میجر: "بہتر۔"

پروفیسر: "نہایت مہربانی۔ کیا آپ مقیاس الحرارت کا استعمال جانتے ہیں؟"

میجر: "بیشک۔"

پروفیسر: "بہت خوب ٹیلیفون کے ڈھکنے پر کاغذ کے پاس ایک نلکی رکھی ہے اس میں سے مقیاس الحرارت نکال لیجئے اور نہایت احتیاط سے بتلایئے کہ پارہ کس درجہ پر ہے؟"

میجر: "ستانوے۔"

پروفیسر: "نہایت مہربانی۔ بہت بہت شکریہ۔ مجھے خیال نہیں تھا کہ فوج میں ایسے سمجھدار لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اخبار بھی لوگوں کو کس قدر دھوکا دیتے ہیں۔ کہ اس کے خلاف ظاہر کرتے ہیں اب آپ مقیاس الحرارت کو دو منٹ تک اپنی زبان کے نیچے رکھئے اور اس کے بعد مجھے بتایئے کہ پارہ کتنے درجے اوپر چڑھا۔"

میجر: "دو منٹ کے بعد ننانوے۔"

پروفیسر: "بہت بہت مہربانی۔ آپ رسالہ میں تھے یا پیدلوں میں؟"

میجر: "رسالہ میں۔"

پروفیسر: "رسالہ میں؟ بہت بہت مہربانی۔ آپکی شادی ہو چکی ہے؟"

میجر:۔ "نہیں۔"

پروفیسر:۔ "تب تو کیا ہی کہنے ہیں۔ آپ کو درد سر کی شکایت تو نہیں ہے؟"

میجر:۔ "ابھی تک تو نہ تھی لیکن آپکے مسلسل سوالات کی عنایت سے تھوڑی دیر میں ضرور ہو جائیگی۔"

پروفیسر:۔ "آپ مہربانی فرما کر صرف علامات ہی بتائے جائیے تشخیص کا کام اس خاکسار کے سپرد کر دیجئے۔ آپکے قلب کی حرکت کی کیا کیفیت ہے؟"

میجر:۔ "خوب زور سے دھڑک رہا ہے۔"

پروفیسر:۔ "ابھی کیا آگے چل کر دیکھئے گا کہ کیسا دھڑکتا ہے۔ تنفس کیسا ہے؟"

میجر:۔ "دم گھٹا جاتا ہے۔ اگر آپ مجھے تازہ ہوا کھانے کے لئے ایک منٹ کو باہر آنے دیں تو بڑی عنایت ہوگی۔"

پروفیسر:۔ "نہ حضرت تازہ ہوا کو ابھی اپنے تنفس سے زیر بار فرمانے کا خیال دل میں نہ لائیے۔ تجربہ ختم ہونے سے پہلے آپ کا باہر تشریف لانا ناممکنات میں سے ہے۔ فوج والوں کے ذی ہوش ہونے کے متعلق جو رائے میں نے قائم کی تھی عجب نہیں کہ آگے چل کر وہ غلط ثابت ہو۔ کوئی عقلمند شخص دوران تجربہ میں اس قسم کی خواہش کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اچھا بالفعل کچھ دیر کیلئے میں اپنے سوالات ملتوی کرتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں پھر گھنٹی بجاؤں گا اگر آپ کو مجھ سے کچھ ارشاد کرنا ہو تو میں یہیں حاضر ہوں۔ اس عرصہ میں آپ تھوڑی سی چہل قدمی کر کے تازہ دم ہو جائیں گے۔"

میجر ٹیلیفون کے پاس سے ہٹ گیا۔ کمرہ کی ہوا بہت ہلکی ہو گئی تھی۔ ریڈیم کی شعاعیں زیادہ تیز اور چمکدار ہو چلی تھیں۔ جب وہ اس کی طرف بڑھا تو اسے ایک فوری بیچینی محسوس ہوئی جس طرح دہکتی ہوئی آگ کے سامنے

جسم کو برہنہ کرنے سے جلن معلوم ہوتی ہے اسی طرح اُسے ریڈیم کی طرف بڑھتے وقت ایسا معلوم ہُوا کہ اُس کے جسم کے سامنے کا حصّہ آگ میں جُھلس گیا ہے۔ سانس بھی رُک رُک کر آنے لگی۔ دردسر بھی معلوم ہونے لگا۔ وہ فوراً پیچھے ہٹ کر دیوار کے ایک کونے میں جا کھڑا ہُوا۔ میز سے علیحدہ جا کھڑے ہونے سے ان علامتوں کی سختی کم ہو گئی۔ اتنے میں گھنٹی پھر بجی اور پروفیسر کی آواز آئی:۔

مناسب ہو گا کہ میں آپکو متنبہ کر دوں کہ اگر آپ ریڈیم کو ضائع کرنے کی کوشش کرینگے تو اُس سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ اگر آپ نے ریڈیم کے ٹکڑے کو توڑ دیا یا کچل ڈالا تو اور بھی مضر ہو گا کیونکہ اس حالت میں اسکے ذرّات منتشر ہو کر آپکے جسم میں نفوذ کر جائیں گے۔ اس وقت جو کیفیت آپ کو محسوس ہو گی۔ وہ نہایت ہی دلچسپ ہو گی۔ بشرطیکہ آپ اُس کا تجربہ کرنا چاہیں لیکن نتیجہ کا ذمہ وار میں نہ ہونگا۔ بہرحال اتنا میں آپکو سمجھائے دیتا ہوں۔ کہ آپ اس نئے زبردست عنصر سے اُس حالت میں کسی طرح بچ نہیں سکتے۔ جبکہ آپ اس کے ساتھ ایک کمرہ میں بند ہیں۔ خصوصاً جبکہ وہ کمرہ صرف بارہ فیٹ مربع ہے۔

بیچارے میجر نے اُس کا کچھ جواب نہ دیا۔ ٹیلیفون کے تار کے دوسرے سرے پر پروفیسر رابرٹ بلتھ فیلو آف دی رائل سوسائٹی۔ ڈاکٹر آف سائنس کھڑے تھے جن کی تحقیقات و اکتشافات نے علمی دُنیا میں ہل چل ڈالدی تھی۔ عام طور سے پروفیسر نہایت متین اور سنجیدہ شخص تھا اور اپنے اندرونی جذبات کو کبھی شکل سے ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔ اُسکے دوست کہا کرتے تھے کہ پروفیسر کے چہرہ پر سوائے اُس حالت کے جبکہ وہ کوئی تجربہ کامیابی کے

ساتھ کر رہا ہو خوشی کے آثار اور کبھی نہیں پائے جاتے۔ یہ قول بالکل صحیح تھا کیونکہ اس وقت وہ رچرڈ مارکھم سابق ملازم رسالہ شاہی و حال مقید کمرہ پروفیسر موصوف کے بیان کردہ تجربوں کو دجسے اُنھوں نے قلم بند کرلیا تھا) پڑھ پڑھ کر باغ باغ ہُوئے جاتے تھے۔ پڑھتے تھے اور خوش ہوتے تھے کہ سائنس کی دُنیا میں کس قدر اضافہ ہُوا اور جوشِ مسّرت میں پھر پڑھتے تھے۔

"نفس کی رفتار ۳۷ حرارتِ غریزی ۹۹۔ قلب کی حرکت بے قاعدہ نہایت ہی عُمدہ نتائج ہیں اسائنس رُک رُک کر آتی ہے یہ بھی قرینِ قیاس ہے کیونکہ اُسے مقید ہُوئے ۳۱ منٹ گذر چکے۔ جسم مضبوط ہے اسی لئے ابھی تک کچھ زیادہ محسوس نہیں ہُوئی۔ لیکن اب تھوڑی دیر میں دیکھنا کیا ہوتا ہے جناب رچرڈ مارکھم۔ آج تو آپ بے طرح پھنسے۔ اگر آپ مجرم نہ ہوتے تو مَیں آپ کو اس بلا میں پھنساتے ہوئے جھجکتا لیکن بحالتِ موجودہ تو آپ کو اس سائنس کی راہ میں ضرور ہی یہ مُصیبت جھیلنی چاہیئے۔ اگر آج کا تجربہ آپکے ذہن عالی سے اُتر نہ گیا تو عمر بھر پھر چوری نہ کیجئے گا۔

"حقیقت میں یہ بات عجائباتِ قدرت سے ہے کہ عقل ہمیشہ مادہ پر غالب آتی ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ رچرڈ مارکھم جیسا قوی ہیکل اور زبردست آدمی مجھ جیسے ضعیف و نحیف شخص کے ایک اشارہ سے برابر والے کمرہ میں اس طرح بند ہو جائے جس طرح چوہا چوہے دان میں بند ہو جاتا ہے میں نے اپنی تحقیقات کا اشتہار اخباروں میں دے کر اپنی کمال دانشمندی کا ثبوت دیا۔ آجکل جتنے جرائم پیشہ لوگ ہیں سب اخبار پڑھتے ہیں۔ میرا یہ خیال صحیح تھا کہ اس اشتہار پر ضرور کسی چور کی نظر پڑیگی۔ اس کے بعد میں نے

ریڈیم کو کمرہ کے وسط میں رکھ دیا اور مقابل والی دیوار پر سلفائیڈ آف زنک مل دیا۔ تاکہ چور کو ریڈیم ڈھونڈھنے میں ذرا بھی دقت نہ ہو۔ ایک ایسی ڈیلیز کا تیار کرنا جس میں سے گذرتے ہی دروازہ کھٹ سے بند ہو جائے میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بس اب اس کے بعد اُس کا انتظار تھا کہ چور آئے اور جال میں پھنسے جو ہو کر رہا +

اس وقت گھنٹی بجی۔ پروفیسر فوراً آرام کرسی پر سے اُٹھا اور ٹیلیفون کے پاس جا کر کہنے لگا:۔

"رچرڈ مارکھم صاحب! کیا آپ کی بیچینی بڑھنے لگی؟ فرمائیے کیا ارشاد ہے"

میجر:۔ "کیا تم خداوند یسوع مسیح کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہو؟"

پروفیسر:۔ "کہتے تو ایسا ہی ہیں۔ مگر اس سوال سے آپ کا مطلب؟"

میجر:۔ "جو شخص مسیح پر ایمان رکھتا ہو اور بہشت میں جانیکا آرزومند ہو کیا وہ ایسی حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے کہ مجھے اس کمرہ میں بند کر کے دوزخ کی آگ کا ٹکڑا میرے سامنے رکھدے، کیا تم نہیں جانتے کہ میں اس آگ میں کباب ہُوا جا رہا ہوں اس کا زہر میرے جسم میں پھیل رہا ہے۔ اسکے ڈنکے میرا دم گھونٹ رہے ہیں۔ اس کا اثر میرے دماغ پر چھایا جا رہا ہے۔ اگر تم عیسائی ہو تو کمرہ کھولدو اور مجھے باہر نکلنے دو"

پروفیسر:۔ "یہ آپ اپنے دماغ کو بیفائدہ تکلیف کیوں دے رہے ہیں۔ آپکا کوئی حق نہیں ہے کہ تجربہ ختم ہونے سے پہلے باہر نکلنے کا نام لیں۔ چونکہ آپ چور ہیں اس لئے آپ کو قرار واقعی سزا بھگتنی چاہیئے۔ اور آپ فوج میں ملازم رہ چکے ہیں بیسیوں لڑائیاں لڑی ہونگی۔ خون کے نالے بہتے لوگوں کے مینہ برستے دیکھے ہونگے۔ تھوڑی دیر کے لئے سمجھ لیجئے کہ وہی ہنگامہ بپا ہے۔ آپ

نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کی تھوڑی دیر کی تکلیف سے بنی نوع انسان کو کس قدر فائدہ پہنچے گا۔ میں آپ کی اس تکلیف کا حال نمک مرچ لگا کر برٹش میڈیکل جرنل میں شائع کر دونگا۔ اور مجھے یقین کامل ہے کہ آپکے خویش و اقارب جب اُسے پڑھینگے تو آپکی ذات پر فخر کرینگے"

میجر:"میں خویش و اقارب سب کو پانی دے چکا ہوں۔ اور اگر کوئی ہوتا بھی تو تیری اس بکواس کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ دروازہ کھولتا ہے تو کھول نہیں تو میں کوئی ایسی بات کر گذروں گا کہ تو عمر بھر پچتائیگا"

پروفیسر:"حضرت اس کی طرف سے اطمینان رکھیئے۔ کمرہ میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کی طرف سے خدشہ ہو۔ ریڈیم ہے۔ سو اس کے توڑنے سے آپکی جان پر ہی بن جائیگی۔ رہا ٹیلیفون اسکے ضائع کرنیکا نتیجہ یہ ہوگا کہ بیرونی دُنیا سے جو رہا سہا تعلق آپ کا ہے وہ بھی منقطع ہو جائیگا۔ آپ ہمّت کیوں ہارے جاتے ہیں۔ کلکتہ کے بلیک ہول والے واقعہ کا ذکر تو آپ نے پڑھا ہی ہوگا۔ اُن بیچاروں کی حالت تو آپ سے زیادہ خراب تھی"

میجر:"تیری اور تیرے بلیک ہول کی ایسی تیسی۔ رہ تو جا ملعون۔ خبیث۔ پاجی۔ اگر جیتا بچا تو تیری ہڈیاں چور چور نہ کر دی ہوں تو نام نہیں"

پروفیسر:"جناب عالی! آپ اس قدر گرم کیوں ہوتے ہیں مزاج درست رکھیئے کمرہ میں چہل قدمی کیجئے۔ انشاء اللہ طبیعت جلد بحال ہو جائے گی ہاں تھرمامیٹر بھر زبان کے نیچے رکھ کر مجھے بتائیے کہ پارہ کتنے درجہ پر ہے سائنس کی کچھ نہ کچھ خدمت بجا لاتے رہیئے۔ بیکار رہنا ٹھیک نہیں (دل میں) بچالو اب تو چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا۔ اگر پانچ سنٹی گرام ریڈیم کلورائیڈ سے ۸ چوہے تین دن میں مرجاتے ہیں تو ایک تولہ ریڈیم برومائیڈ ایک مضبوط آدمی

کو کتنی دیر میں بیہوش کر سکیگا۔ اربعہ تناسبہ کا یہ سوال کئی دن سے حل طلب تھا اب وہ وقت آگیا کہ کوئی شخص اس کو حل کرے اور وہ شخص پروفیسر بلتھ ہو گا"

کچھ دیر میں گھنٹی بجی اور آواز آئی:-

حرارت غریزی ۱۰۲ نبض ۱۰۰۔ ابے او پاپی پروفیسر خدا کے لئے اب تو مجھ پر رحم کر۔ اگر مسیح کی خاطر نہیں تو کم ازکم اس خیال سے چھوڑ دے کہ تو بھی بال بچوں والا ہے"

پروفیسر:۔ (میجر کی بات سُنی ان سُنی ایک کرکے) نبض ۱۰۰۔ غالباً ناہموار ہو گی"

میجر:۔ اپنی ہی کہے جاتا ہے میری ایک نہیں سُنتا"

پروفیسر:۔ رچرڈ مارکھم صاحب از برائے خدا انصاف کیجئے کہ جو قرارداد مجھ میں آپ میں ہوا تھا اُس کے لحاظ سے آیا یہ مناسب ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ تجربہ سے خاطر خواہ نتائج مستنبط ہو رہے ہیں آپ اپنی رہائی کے لئے زور دیں اور تجربہ کو آخر تک پہنچانے سے پہلو تہی کریں۔ اگر علمی دُنیا پر احسان نہیں کرنا چاہتے تو کم ازکم ایفائے عہد ہی کے خیال سے اپنی بات پر قائم رہیئے۔ ہاں تو کیا آپ کی نبض ناہموار رہے؟"

میجر:۔ ہاں ہے تو لیکن مرے ہاتھ بھی کھجلا رہے ہیں کہ تیری چاند گنجی کر دیں پروفیسر بلتھ یاد رکھ اگر آج مرا دم نکل گیا تو خبیث بن کر تجھے اور تیرے گھر بھر کو پانچویں پشت تک کھا جاؤں گا دیکھ لینا تو پاگل ہو کر بھونک بھونک کتّے کی موت مریگا۔ کھول کواڑ او پاجی گدھے......"

گالیاں سُن کر پروفیسر ٹیلیفون سے ہٹ گیا اور اپنی مختصر سی ڈاڑھی

پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا:۔

"ادنےٰ درجہ کے اراذل و انفار کی خاص خصوصیت ہے کہ سختی کے وقت گندہ دہان ہو جاتے ہیں مجھ پر خواہ کیسا ہی وقت کیوں نہ آ پڑے۔ ممکن کیا کہ پایۂ تہذیب اور درجۂ ثقاہت سے گرا ہُوا کوئی لفظ میری زبان سے ادا ہو۔ شرافت خاندانی اور اعلیٰ تعلیم کے یہی تو جوہر ہیں۔ لیکن رچرڈ مارکھم نے میرے استفسارات کا جواب جس تشفی بخش طریقہ سے دیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم اچھی پائی ہے اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ آخر میں شرافتِ خاندانی بازی لیجاتی ہے"

یہ کہکر پروفیسر نے بڑے فخر سے پھر اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ دیر گذرنے کے بعد پروفیسر نے اس خیال سے کہ اس کے قیدی کی حالت ضرور متغیر ہونی شروع ہُوئی ہوگی۔ گھنٹی بجائی لیکن کچھ جواب نہ ملا۔ پروفیسر نے دل میں کہا کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک ۳۵ سال کا جوان سپاہی ایسی جلدی میں بیہوش ہو گیا ہو ضرور ہے کہ وہ کمرہ میں چہل قدمی کر رہا ہو۔ یہ سوچ کر اس نے پھر گھنٹی بجائی۔ اس دفعہ آہستہ سے جواب آیا جسے سُن کر پروفیسر نے کہا:۔ جناب آپ نے جواب کیوں نہ دیا؟"

میجر:۔ جیسے میں تیرے باپ کا نوکر ہوں۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر تو میرے ہاتھ آجائے تو تجھے کن عذابوں سے ماروں۔ ابے سُنتا ہے کہ نہیں۔ اس آگ کو دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں پھوٹ چلیں۔ اب تو میری روح تحلیل ہُوئی جاتی ہے۔ اب مجھے پولیس ویس کی کوئی پروا نہیں۔ تیرا جی چاہے تو گرفتار کرا دے"

پروفیسر:۔ جناب عالی آپکی گفتگو پایۂ ثقاہت اور درجہ تہذیب سے گری

ہوئی ہے مجھے آپ کے اس اشتعالِ طبع پر رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے۔ آپ جیسا جوان اور بچوں کی طرح بگڑے اور بڈھوں کی طرح چڑے۔ اب تو میں پولیس کو بلانے سے رہا۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ یہ تجربہ ختم تک پہنچا دیں گے اور ایفائے وعدہ آپ کا فرض ہے۔ اب کہئے نبض کی رفتار کیا ہے؟"

میجر: "ایکسو بیس[۱۲۰] ہے گھڑی کی طرح ٹک ٹک چل رہی ہے اور کوئی تعجب نہیں۔ اگر آگے چل کر گھنٹے کی طرح ٹن ٹن کرنے لگے۔"

پروفیسر: "ہمت نہ ہاریئے۔ آپکے ہاتھوں کی رنگت نیلی ہے؟"

میجر: "نیلی تو نہیں سبز ہے؟"

پروفیسر: "سبز! ناممکن ہے۔"

میجر: "ممکن ہے کہ حقیقت میں نیلی ہو کیونکہ میری نگاہ خراب ہے رنگوں میں امتیاز نہیں کر سکتا"

پروفیسر: "سپاہی ہو کر آپ کی بصارت ایسی ضعیف ہو! سخت تعجب ہے شاید آپ کے ہاتھ میلے ہونگے۔ اس وجہ سے نیلاہٹ میں ہریائی معلوم ہوتی ہوگی آپ کی انگلیوں میں درد تو نہیں ہوتا؟"

میجر: "صرف ہاتھ بلکہ پاؤں کی انگلیوں میں بھی ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں۔"

پروفیسر: "مرحبا اور حرارتِ غریزی؟"

میجر: "۱۰۳۔ ارے میں گرمی کے مارے بھنا جاتا ہوں کیا تو نے مجھے مار ہی ڈالنے کی ٹھانی ہے؟"

پروفیسر: "ابھی کل سوا گھنٹہ ہوا ہے اس پر یہ شور بپا کر دیا کہ الاماں ابھی تو تجربہ کی ابتدا ہی ہے۔" یہ کہکر پروفیسر برآمدہ میں ٹہلنے اور اپنے دل سے باتیں کرنے لگا:۔

"کاش! کٹرپ یہاں موجود ہوتا۔ میں ثابت کر کے اُس سے منوا لیتا۔ کہ اُس کی یہ رائے بالکل غلط ہے کہ ریڈیم کے اثر سے خون کے کارپسل کیسجن سے خالی ہو کر بیہوشی کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ میں علمی دُنیا کے سامنے اب یہ اصول پیش کر سکونگا کہ ریڈیم کے فعل سے اعصاب متاثر ہوتے ہیں اور معمول مفلوج ہو جاتا ہے۔ کنٹر بیوقوف ہے۔ اپنی بات پر اڑا رہا اب اُسے میری بات ماننی پڑیگی"

اتنے میں پھر گھنٹی بجی اور میجر کی آواز آئی:۔

پروفیسر بلتھ اچھی طرح سُن اگر تو نے فوراً دروازہ نہ کھول دیا تو میں یہ ریڈیم نگل جاؤنگا اور تو ٹاپتا رہ جائیگا۔ ریڈیم نگل لینے سے میری حالت اس سے تو خراب ہونے سے رہی جیسی اس وقت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس قدر جلد میرا دم نکل جائے اچھا ہے۔

پروفیسر: "آپ احمق نہ بنئے جو تکلیف آپ کو اس وقت ہو رہی ہے۔ اس میں بہت زیادتی ہو جائیگی"

میجر: "کچھ پروا نہیں ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پروفیسر ٹیلیفون بند کر کے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا اور دل میں کہنے لگا:۔

اس شخص نے تو مجھے مایوس کر دیا خدا ہی ہے جو تجربہ حسب مراد ختم ہو۔ یہ شخص تو جلدی ہمت ہار گیا۔ آخر رذیل ہے نہ محض گوشت و خون کا تودہ کیا کر سکتا ہے۔ جب تک شرافت و علم نہ ہو"

کچھ دیر کے بعد پروفیسر نے پھر گھنٹی بجائی لیکن اس دفعہ جو جواب اسے ملے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ قیدی کا دماغ چل گیا۔ جو آوازیں پروفیسر کے کان میں رُک رُک کر آئیں وہ یہ تھیں:۔

بلتھ کے سر پر بلّی ناچی۔ او سوار گھوڑا دوڑائے کدھر جاتا ہے۔ برف گر رہی ہے۔ بلتھ پیپا بنا ہُوا سڑک پر لٹک رہا ہے۔

پروفیسر:- مارکھم صاحب خدا کے واسطے حواس بجا رکھیئے۔ مجھے ابھی بہت دیر تک تجربہ کرنا ہے۔ آپکے اختلالِ حواس سے میرا بنا بنایا کھیل بگڑ جائیگا +

میجر:- اہاہاہا اوہو ہو ہو۔ سوارو تلواریں کھینچ کر بڑھو اور دشمن کو کاٹ ڈالو۔ بور۔ جاپانی اور روسی گلے مل رہے ہیں۔ شاباش میرے بہادرو۔ گھر کو پلٹ چلو...... واہ رے میں تلوار سے ایک سارجنٹ میجر کے دو ٹکڑے کر دئے"

اس کے بعد ٹیلیفون میں قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں جنہیں سُن کر پروفیسر نہایت افسردہ ہُوا۔ تجربہ کے اس طرح رُک جانے سے اُس کی خوشی خاک میں مل گئی کچھ دیر کے بعد اُس نے گھنٹی بجائی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے تھوڑی تھوڑی دیر بعد پھر گھنٹی بجائی لیکن جواب نہ ملا۔ آخر پروفیسر نے غمزدہ آواز میں کہا:-

اب تو دروازہ کھولنا ہی چاہیئے۔ یہ شخص بیہوش پڑا ہُوا ہے اور اِس حالت میں اگر دیر تک ریڈیم کی شعاعوں کے سامنے رہا تو ممکن ہے کہ نتیجہ اچھا نہ ہو"

یہ کہکر اُس نے دروازہ کھولا۔ کمرہ میں اندھیرا تھا۔ پروفیسر سخت متعجب ہُوا اور دل میں کہنے لگا:-

یہ ریڈیم کہاں غائب ہو گیا؟ کہیں حقیقت میں نگل ہی تو نہیں گیا؟ آگے بڑھ کر اُس نے چاہا کہ بٹن دبائے تاکہ کمرہ میں بجلی کی روشنی ہو جائے۔ اس نے قدم اندر رکھا ہی تھا کہ دروازہ بڑے زور سے بند ہو گیا۔ پروفیسر نے